ماہ نامہ
ہمدرد
نونہال
۲۰۱۱ء
خاص نمبر
خاص تحفہ بھی
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

یادگار: شہید پاکستان حکیم محمد سعید

خاص نمبر

اشاعت کا ۵۹ واں سال

ماہ نامہ

ہمدرد نونہال

کراچی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

صدر مجلس: **سعدیہ راشد**

مدیر اعلا: **مسعود احمد برکاتی**

قیمت خاص نمبر ۴۰ رُپے

قیمت عام شمارہ ۳۰ رُپے

جون ۲۰۱۱ عیسوی — رجب المرجب ۱۴۳۲ ہجری

شمارہ ۶ — جلد ۵۹

ٹیلے فون ——— 36620945 — 36620949

ایکسٹینشن ——— (034 ، 052 ، 056)

ٹیلے فیکس نمبر ——— 92-021) 36611755

ای میل ——— hfp@hamdardfoundation.org

ویب سائٹ ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان ——— www.hamdardfoundation.org

ویب سائٹ ہمدرد لیبارٹریز (وقف) ——— www.hamdardlabswaqf.org

ویب سائٹ ادارہ سعید ——— www.hakimsaid.info

دفتر ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی ۷۴۶۰۰

ڈاک خانے کے نئے قاعدوں کی وجہ سے آیندہ ہمدرد نونہال کی قیمت صرف
بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں قابلِ قبول ہوگی، VPP بھیجنا ممکن نہیں ہے

قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ کا احترام ہم سب پر فرض ہے

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی اور ہمدرد فاؤنڈیشن نے عظیم نونہالانِ پاکستان کی تعلیم و تربیت اور صحت و مسرت کے لیے شائع کیا

سعدیہ راشد پبلشر نے ماس پرنٹرز کراچی سے چھپوا کر
ادارہ مطبوعات ہمدرد ناظم آباد کراچی سے شائع کیا

سرورق کی تصویر	مریم اقبال بنت حکیم خورشید اقبال، کراچی

ISSN 02 59-3734

اس شمارے میں کیا کیا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جاگو جگاؤ

نونہالوں کے دوست اور ہمدرد

شہید حکیم محمد سعید

کی یادرہنے والی باتیں

آج دنیا امن کے لیے ترس رہی ہے۔ ہر طرف لڑائی، جھگڑے اور فساد و بدامنی کا بازار گرم ہے۔ خود ہمارے پیارے وطن میں بھی امن و سکون گھٹتا ہے اور یہ بات زیادہ تکلیف دہ ہے کہ مسلمانوں کے ملک میں امن کا دور دورہ نہ ہو، کیوں کہ امن تو ایمان کا حصہ ہے۔ ایمان، امن اس لیے ہے کہ ایک انسان اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا کر آخرت کے عذاب سے مامون و محفوظ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں بھی اس کو بہت سی برائیوں سے نجات ملتی اور راحت میسر آ جاتی ہے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں نہ صرف پُرامن ہونا چاہیے، بلکہ ہماری پوری زندگی امن کا پیغام ہونا چاہیے۔ سورہ النساء کی آیت ۹۰ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اگر وہ (کفار) لڑائی کرتے کرتے اس سے گریز کریں، تم سے نہ لڑیں اور صلح کرنا چاہیں تو اللہ تمھیں ان سے لڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔'' (ترجمہ)

گویا مسلمان کو دشمن سے بھی اس وقت تک مقابلہ کرنے کی اجازت ہے جب تک کہ دشمن لڑے، لیکن جب دشمن لڑتے لڑتے صلح کی درخواست کرے تو مسلمانوں کے لیے حکم یہی ہے کہ وہ صلح قبول کر لیں۔

آج ہم جن حالات سے دوچار ہیں، ان کی وجہ پر غور کریں تو ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کی خلاف ورزی ہی اس کا سبب ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور اتحاد کے ساتھ رہیں اور ایک دوسرے کی غلطیوں کو درگزر کریں اور اپنے اچھے سلوک سے غلط کاروں کی اصلاح کریں۔

(ہمدرد نونہال اکتوبر ۱۹۹۴ء سے لیا گیا)

پہلی بات

مسعود احمد برکاتی

اس مہینے کا خیال

سادگی، کفایت اور محنت

زندگی کو آسان اور پُرسکون بنانے والے تین بڑے ستون

السلام علیکم!

خاص نمبر پیش کرنے کی مسرت حاصل کر رہا ہوں!

مسرت کے ساتھ اطمینان بھی ہے کہ خاص نمبر کو ہم جیسا بنانا چاہتے تھے، ویسا بن گیا۔ مجھے یقین ہے کہ خاص نمبر پڑھ کر آپ بھی اتفاق کریں گے کہ واقعی ہم نے دل سے محنت کی ہے۔ ہم ہی نے نہیں، خاص نمبر کے لیے لکھنے والوں نے بھی محنت اور محبت سے لکھا ہے۔ آپ پڑھنے کے بعد جب خوشی کا اظہار کریں گے تو ہمیں ہی نہیں سب لکھنے والوں کو خوشی ہوگی کہ ان کی کہانیاں، نظمیں، معلوماتی تحریریں آپ کو پسند آئیں۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ہمدرد نونہال شہید پاکستان حکیم محمد سعید کی یادگار ہے۔ وہ اس کے بانی تھے اور اس کی بہتری اور ترقی کے ہر کام سے خوش ہوتے تھے۔ ان کی خوشی سے میری ہمت بڑھتی تھی اور مجھ میں نیا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ افسوس کہ ظالموں نے ہمارے ایک خیر خواہ اور محسن سے قوم کو محروم کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ حکیم صاحب کی روح خوش ہوگی کہ ان کا ہمدرد نونہال علم اور نونہالوں کی خدمت میں اب بھی مصروف ہے۔

ہمدرد نونہال اپنی زندگی اور خدمت کے ۵۹ ویں سال میں ہے۔ اس عرصے میں اس کے پڑھنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اب ماشاء اللہ دادا، دادی بن گئے ہیں اور بعض تو پردادا، پردادی بھی بن گئے ہیں۔ اپنے بچپن میں ہمدرد نونہال پڑھنے والوں میں اب ہر قسم کے، ہر شعبے کے بے شمار افراد شامل ہیں۔ ان میں بڑے بڑے ادیب، صحافی، عالم، حکیم، ڈاکٹر، استاد، تاجر، صنعت کار، سیاست داں، افسر، وزیر، وزیر اعظم بھی شامل ہیں۔ یہ سب ہمدرد نونہال کی تحریروں سے مستفید ہوئے۔ الحمدللہ یہ خدمت جاری ہے۔

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے تعاون اور محترمہ سعدیہ راشد کی سرپرستی کی وجہ سے خاص نمبر کی قیمت کم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ خاص نمبر بھی ۴۰ روپے میں انھی کی وجہ سے آپ کو مل رہا ہے۔

خاص نمبر کی ترتیب و تیاری میں تعاون کے لیے میں اپنے ساتھیوں خصوصاً سلیم فرخی، جدون ادیب، شکیل صدیقی، محمد اکرم خاں کا بھی شکر گزار ہوں۔

خاص نمبر کے بارے میں آپ کی کھری کھری باتوں کا منتظر ہوں۔ ☆

روشن خیالات

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

بہتر صدقہ یہ ہے کہ کسی بھوکے کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جائے۔

مرسلہ: حامد عبدالباقی، حویلیاں

حضرت جنید بغدادیؒ

کسی سے نیکی کرتے وقت بدلے کی توقع مت رکھو، کیوں کہ اچھائی کا بدلہ انسان نہیں خدا دیتا ہے۔

مرسلہ: نبیلہ قمر اللہ بلوچ، اوتھل

مولانا رومی

دل ایک آئینہ ہے اگر وہ بدی سے پاک ہو تو اس میں خدا بھی نظر آ سکتا ہے۔

مرسلہ: اُم ہدیٰ، میر پور خاص

حضرت امام غزالیؒ

لوگوں کی نیکیوں کو ظاہر کرو اور برائیوں سے چشم پوشی کرو۔

مرسلہ: محمد ابوبکر وقاص، لودھراں

سرسید احمد خاں

دل کو ہلاک کرنے والی بیماریوں میں ایک بیماری خوشامد ہے۔

مرسلہ: کہکشاں ارجمند، نارتھ کراچی

مولوی عبدالحق

استاد وہ ہستی ہے جو تمھیں اندھیرے سے نکال کر روشنی کی راہ دکھاتی ہے۔

مرسلہ: محمد زبیر ارشد، ملتان

شہید حکیم محمد سعید

نعمتیں ان کو ملتی ہیں، جو نعمتوں کی قدر کرتے ہیں۔

مرسلہ: محمد سعد افراہیم، کراچی

ٹالسٹائی

بُری کتابوں کا زہر، انسان کی روح کو مار ڈالتا ہے۔

مرسلہ: کرن اقبال بھٹی، سانگھڑ

☆☆☆

اے خدا

عباس العزم

تُو ہی ربِ دو جہاں ہے اے خدا
مالکِ کون و مکاں ہے اے خدا

اس زمیں پر سر کشیدہ یہ پہاڑ
تیری عظمت کا نشاں ہے اے خدا

اپنی اس دنیا کا رکھوالا ہے تُو
تُو ہی سب کا پاسباں ہے اے خدا

تیری عظمت کی نہیں ہے حد کوئی
تیری عظمت بے کراں ہے اے خدا

تیری رحمت کا جہاں میں ہر طرف
ہر گھڑی دریا رواں ہے اے خدا

ذات سے تیری منور ہے زمیں
تجھ سے روشن آسماں ہے اے خدا

بے گماں یکتا ہے تیری ذاتِ پاک
کوئی تجھ جیسا کہاں ہے اے خدا

نعت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

تنویر پھول

شہِ دیں جان و دل سے ہم کو پیارے
وہ بے حد اپنے رب کے ہیں دُلارے

ہوا دو ٹکڑے چاند اور پلٹا سورج
کیے تھے میرے آقاؐ نے اشارے

محبت انؐ سے رکھنا شرطِ ایماں
ہر اک مومن کی آنکھوں کے وہؐ تارے

وہی تو رحمتہ للعالمیںؐ ہیں
غریبوں ، بے کسوں کے وہؐ سہارے

بھنور میں ڈولتی ہے اپنی کشتی
لگائیں گے اسے ، آقاؐ کنارے

وہ ختم الانبیاؐ ، نورِ مبیں ہیں
بتاتے ہم کو ہیں قرآں کے پارے

سراپا نور ہے وہ ذاتِ اقدس
سراپا نور ہیں آقاؐ ہمارے

جہاں میں جتنے بھی آئے پیمبرؑ
تھے انؐ کے مقتدی اقصیٰ میں سارے

کرم ہو پھولؔ پر، ہوں کاش یا رب!
میسّر باغِ طیبہ کے نظارے

لکھ بادشاہ

طالب الہاشمی

چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) کے آخری برسوں میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ہندستان کا رخ کیا۔ سلطان اور اس کی فوج کے جرنیلوں نے علاقے پر علاقے اور شہر پر شہر فتح کرتے کرتے قریب قریب سارے شمالی ہندستان پر قبضہ کرلیا۔ سلطان کی فوج کا سب سے بڑا جرنیل قطب الدین ایبک تھا۔ وہ سالہا سال پہلے ایک غلام کی حیثیت سے سلطان کے پاس آیا تھا، لیکن اپنی بہادری، علمی لیاقت، وفاداری اور دوسری خوبیوں کی بدولت سلطان کا منھ بولا بیٹا اور چہیتا جرنیل بن گیا۔

قطب الدین ایبک نے تعلیم کیسے حاصل کی اور وہ سلطان کی خدمت میں کیسے پہنچا؟ یہ ایک دل چسپ کہانی ہے۔ قطب الدین ایبک کا اصل وطن ترکستان تھا۔ وہ وہاں کے ایبک نام کے ایک ترک قبیلے میں پیدا ہوا تھا، اسی لیے وہ قطب الدین ایبک کے نام سے مشہور ہوا۔ اس زمانے میں بہت سے ملکوں میں غلامی کا رواج تھا اور بعض لوگ غلاموں کی خرید و فروخت کا کام کرتے تھے۔ قطب الدین کو اس کے بچپن میں ایک سوداگر ترکستان سے خرید کر ایران کے شہر نیشاپور لے گیا اور وہاں اس کو قاضی فخر الدین عبدالعزیز کوفی کے ہاتھ فروخت کردیا۔ قاضی صاحب، امام اعظم ابوحنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے اور نہ صرف بہت بڑے عالم تھے بلکہ نیشاپور کے قریبی علاقوں کے حاکم بھی تھے۔ انھوں نے قطب الدین کو اپنی اولاد کی طرح رکھا اور اس کو قرآن پاک اور دوسرے دینی علوم کی تعلیم ایسی شفقت اور توجہ سے دی کہ وہ عالم فاضل ہوگیا۔ قرآن پاک سے اس کے لگاؤ کو دیکھ کر لوگ اس کو قرآن خواں کہنے لگے۔

کہا جاتا ہے کہ نیشاپور ہی میں قطب الدین نے شہسواری، تیراندازی، نیزہ بازی اور تلوار چلانے کے فن سیکھ لیے۔ قاضی صاحب کی وفات کے بعد ان کے ایک لڑکے نے قطب الدین کو کسی تاجر کے ہاتھ فروخت کردیا۔ اس تاجر نے نوجوان قطب الدین کو سلطان شہاب الدین محمد غوری کی خدمت میں پیش کیا۔ سلطان کو وہ اتنا اچھا لگا کہ اس نے بڑی قیمت دے کر اس کو خرید لیا۔ قطب الدین نے اس طرح جان توڑ کر سلطان کی خدمت کی کہ وہ سلطان کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ سلطان نے قطب الدین کو نہ صرف اپنے درباری امیروں میں داخل کرلیا بلکہ ایک اعلا عہدے پر بھی فائز کردیا اور اس کے بیٹھنے کے لیے اپنے تخت کے سامنے ایک خاص جگہ مقرر کردی۔ ایک دفعہ سلطان اور خراسان کے بادشاہ کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ اس جنگ میں قطب الدین دشمن کے خلاف بڑی بہادری سے لڑا، لیکن بد قسمتی سے ایک دن دشمن کی فوج کے گھیرے میں آگیا اور گرفتار ہوگیا۔ دشمن نے اسے لوہے کے ایک پنجرے میں بند کرکے قید کردیا۔ چند دن بعد سلطان شہاب الدین کے لشکر نے دشمن کو شکست دی اور جس پنجرے میں قطب الدین قید تھا، اسے ایک اونٹ پر لاد کر سلطان کے سامنے لایا گیا۔

سلطان نے خود قطب الدین کو پنجرے سے نکالا اور اس کے گلے میں جو زنجیر پڑی ہوئی تھی، اس کی جگہ اس کے گلے میں ہیروں کا ہار پہنایا۔ کچھ عرصے بعد سلطان غوری نے شمالی ہندستان کے کچھ علاقے (اجمیر، دلی وغیرہ) فتح کرکے ان پر قطب الدین کو حاکم بنایا اور اس کے ساتھ ہی اس کو اس فوج کا سپہ سالار بنا دیا جو اس نے ہندستان میں چھوڑی اور خود واپس غزنی چلا گیا۔ قطب الدین نے سلطان کے جانے کے بعد میرٹھ، رنتھنبور، الیرہ سمیت کئی اور علاقے فتح کرلیے۔ اس پر سلطان نے اسے غزنی بلا کر شاباش دی اور بے شمار قیمتی تحفے عطا کیے۔ غزنی سے واپس آکر قطب الدین نے اور کئی علاقے فتح

کر لیے۔ جب سلطان غوری قنوج اور بنارس کے راجا سے جنگ کرنے کے لیے ہندستان آیا تو قطب الدین نے اس کی خدمت میں پچاس ہزار سوار، ایک سو عربی گھوڑے اور سیکڑوں ہاتھی اور اونٹ پیش کیے۔ پھر اس نے سلطان کے ساتھ مل کر قنوج اور بنارس فتح کیے۔ اس لڑائی میں اس نے ایسی بہادری دکھائی کہ سلطان نے اسے اپنا منھ بولا بیٹا بنا لیا۔ اس کے بعد قطب الدین اور اس کے فوجی سرداروں کی فوجوں نے گجرات، راجپوتانہ، دریائے گنگا اور جمنا کا دوآبہ، بہار اور بنگال فتح کر لیے۔ ۱۲۰۶ عیسوی میں سلطان غوری ہندستان کی آخری مہم کے بعد پنجاب کی راہ سے اپنے وطن واپس جا رہا تھا کہ جہلم کے قریب دمیک کے مقام پر بعض اسلام دشمنوں نے اسے رات کو اس وقت شہید کر دیا، جب وہ اپنے خیمے کے اندر سو رہا تھا۔

سلطان کی شہادت کے بعد اس کا بھتیجا محمود اس کا جانشین بنا۔ اس نے قطب الدین ایبک کی عزت اپنے چچا سے بھی زیادہ کی اور اسے سلطان کا خطاب دے کر شمالی ہندستان کے فتح کیے ہوئے سارے علاقوں (لاہور اور دلی سمیت) کا خود مختار بادشاہ بنا دیا۔

قطب الدین ایبک بادشاہ تو بن گیا اور بادشاہ بھی بڑا بہادر، رعب اور دبدبے والا، لیکن اس نے ہمیشہ اپنے آپ کو لوگوں (رعایا) کا خادم سمجھا اور ان کو سکھ آرام پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اس لیے لوگ اس کو رحمت کا فرشتہ سمجھتے تھے، اس سے بے حد محبت کرتے تھے اور اس کے حق میں دعائیں کرتے رہتے تھے۔ وہ اتنا دریا دل اور سخی تھا کہ غریبوں، مسکینوں اور حاجت مندوں پر روپے پیسے کی بارش کرتا رہتا تھا۔ اس کی سخاوت نے لوگوں کے دل موہ لیے تھے اور انھوں نے اس کو لک (لکھ) بخش کا خطاب دیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ہر طبقے کے لوگوں خصوصاً حاجت مندوں، طالب علموں اور دین کے

عالموں پر لاکھوں روپے لٹاتا رہتا تھا۔ بہت سے لوگ اسے دوسرا حاتم (حاتم ثانی) کہتے تھے۔ اس کی سخاوت نے سارے شمالی ہندستان کو اس کا مطیع بنا دیا تھا، یہاں تک کہ ایک شخص بھی اس کا دشمن نہ تھا۔

بے انتہا سخی ہونے کے ساتھ سلطان قطب الدین پکا اور سچا مسلمان بھی تھا۔ اس نے تخت پر بیٹھتے ہی مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ اسلامی شریعت کے مطابق زندگی گزاریں اور بری رسموں سے پرہیز کریں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عدل و انصاف کی ایسی مثال قائم کی کہ آیندہ نسلوں کے لیے نمونہ بن گئی۔ کسی طاقت ور کی مجال نہ تھی کہ کسی کم زور پر ظلم کر سکے۔ اس کے لشکر میں ترک، افغان، غوری اور خلجی وغیرہ ہر طرح کے لوگ تھے، لیکن کسی کی یہ ہمت نہ تھی کہ جنگل سے کسی کی بکری یا آبادی سے کسی کی کوئی مرغی پکڑ لیتا یا کسی کے گھر میں گھس جاتا۔ تمام رعایا خوش حال اور مطمئن زندگی بسر کرتی تھی۔ تعصب بالکل نہ تھا، غیر مسلم بھی مسلمانوں کے برابر سلطان کی سخاوت سے حصہ پاتے تھے۔ سلطان کی علم دوستی کی بھی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ دینی مدرسوں اور دین کے عالموں کی دل کھول کر مدد اور سرپرستی کرتا تھا۔ مختلف علوم و فنون میں کمال رکھنے والے لوگوں کے سلطان نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ ان میں قاری، شاعر، ادیب اور صوفی ہر طبقے کے اصحاب شامل تھے۔ سلطان نے دلی اور اجمیر میں شان دار مسجدیں بھی تعمیر کروائیں۔

افسوس کہ اس نیک بادشاہ کا زمانہ حکومت صرف چار برس رہا۔ ۱۲۱۰ عیسوی میں وہ لاہور میں چوگان کھیل رہا تھا کہ یکا یک گھوڑے سے گر کر سخت زخمی ہو گیا اور زخموں کی تاب نہ لا کر فوت ہو گیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ سلطان قطب الدین ایبک نے اپنی سخاوت، علم دوستی اور عدل و انصاف کا جو نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا، وہ اس کا نام قیامت تک زندہ رکھے گا۔ ☆

زندہ رہنے والا کام

سعدیہ راشد

آج ایک کہانی پڑھیے۔ یہ کہانی خیالی نہیں ہے، بلکہ سچی کہانی ہے۔

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ ہارورڈ یونی ورسٹی کے دفتر میں ایک خاتون اور ان کے شوہر پہنچے۔ اس جوڑے کے لباس اور انداز سے سادگی اور عاجزی ظاہر ہو رہی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی نے یونی ورسٹی کے صدر صاحب سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ صدر صاحب کی سکریٹری نے دونوں کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا۔ ان کی ظاہری حالت سے سکریٹری متاثر نہیں ہوئیں اور انھوں نے ان کو ٹالنا چاہا کہ صاحب اس وقت میٹنگ میں ہیں۔ اس جوڑے نے کہا کہ کوئی بات نہیں ہے، ہم انتظار کر لیتے ہیں۔ جب کئی گھنٹے گزر گئے تو سکریٹری نے صدر صاحب کو بتایا کہ وہ لوگ آپ سے ملے بغیر نہیں جائیں گے۔ غرض ملاقات ہوئی۔ خاتون نے صدر صاحب سے کہا: ''ہمارا بیٹا آپ کی یونی ورسٹی میں پڑھتا تھا۔ ہماری خواہش ہے کہ بیٹے کی یاد میں یونی ورسٹی میں اس کا ایک مجسمہ نصب کرنے کی اجازت ہمیں مل جائے۔''

صدر صاحب نے ترش لہجے میں جواب دیا: ''اس طرح تو ہر اس شخص کا جس نے یہاں تعلیم حاصل کی ہے، مجسمہ کھڑا کرنا پڑے گا اور ہارورڈ یونی ورسٹی قبرستان لگنے لگے گی۔''

خاتون نے کہا: ''تو پھر اس کے نام کا ایک بلاک بنا دیں۔''

صدر صاحب نے کہا: ''شاید آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ایک بلاک پر کئی ہزار ڈالر خرچ آتا ہے۔''

یہ سن کر خاتون نے شوہر کی طرف مڑ کر سرگوشی کے انداز میں کہا: ''اتنے خرچ کا سوال ہے تو پھر ہم خود اپنے طور پر کچھ کیوں نہ کریں۔''

پھر یہی ہوا۔ یہ دونوں یعنی مسٹر اسٹین فورڈ اور مسز اسٹین فورڈ ایک عزم لے کر وہاں سے اُٹھے۔ انھوں نے اس عزم کو عمل میں ڈھالنے کا پکا ارادہ کر لیا اور خود ایک یونی ورسٹی کی بنیاد ڈال دی۔ اس طرح اسٹین فورڈ یونی ورسٹی وجود میں آئی، جو امریکا میں ہارورڈ یونی ورسٹی کے پائے کی درس گاہ ہے۔

اسٹین فورڈ یونی ورسٹی ۱۸۹۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ جین اور لے لینڈ اسٹین فورڈ (JANE AND LELAND STANFORD) نے یہ اعلا تعلیمی ادارہ اپنے اکلوتے بیٹے لے لینڈ جونیئر کی یادگار کے طور پر بنائی، جن کا ٹائیفائڈ سے پندرہ برس کی عمر میں انتقال ہوا تھا۔ ماں باپ کو صدمہ ہونا تو فطری تھا، لیکن انھوں نے اپنے غم کو ایک منفی کیفیت کے بجائے تعمیری جذبے میں ڈھال دیا۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ اگر ہم قدرت کے لکھے سے مجبور تھے اور اولاد کے لیے کچھ نہ کر سکے تو کم سے کم دوسروں کے بچوں کے لیے تو کچھ کر ڈالیں۔ اس نیک جذبے کو عمل میں لانے کا سب سے اچھا اور مدتوں فیض پہنچانے والا طریقہ ایک یونی ورسٹی کا قیام تھا۔ چناں چہ اس کے لیے انھوں نے جمع پونجی اور جائداد سب کچھ قربان کر دیا۔ نقد رقم کے علاوہ اپنا آٹھ ہزار ایکڑ کا فارم بھی یونی ورسٹی کو دے دیا۔ اسی زمین پر یہ اعلا اور معیاری تعلیمی ادارہ وجود میں آیا، جو امریکا ہی میں نہیں، دنیا بھر میں اپنے نام کی وجہ سے پہچانا اور باوقار سمجھا جاتا ہے۔

دیکھ لیا آپ نے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے کتنی صلاحیتیں اور کتنی توانائی دی ہے۔ وہ جس کام کا عزم کر لے، اس کو مکمل کر ہی لیتا ہے۔ چوں کہ جین اور لے لینڈ نے نیک نیتی اور خدمت کے جذبے سے یہ کام شروع کیا تھا، اس لیے وہ نہ صرف پورا ہوا، بلکہ اس سے ہزاروں لوگوں نے فائدہ اُٹھایا اور اُٹھا رہے ہیں اور اُٹھاتے رہیں گے۔

☆☆☆

نونہال ادب کی کتابیں

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کا شعبہ نونہال ادب بچوں کے لیے مختلف موضوعات پر سبق آموز کتابیں اور دل چسپ کہانیاں شائع کرتا ہے۔ ان کی قیمتیں بہت کم رکھی جاتی ہیں۔ نونہال ادب کی کتابیں علم بڑھانے میں بہت مددگار ہوتی ہیں۔ کتابیں پڑھیے اور علم کی روشنی حاصل کیجیے۔

	نام کتاب	مصنف/مرتب	قیمت
۱۔	ابن بطوطہ کا سفرنامہ۔ حصہ اول	رفیع الزماں زبیری	۲۵ روپے
۲۔	ابن بطوطہ کا سفرنامہ۔ حصہ دوم	رفیع الزماں زبیری	۲۵ روپے
۳۔	حکیم عبدالحمید	حکیم محمد سعید	۴۰ روپے
۴۔	فکر جواں	حکیم محمد سعید	۵۰ روپے
۵۔	نونہالوں کے خطوط	حکیم محمد سعید	۱۰ روپے
۶۔	بالید کی فکر	حکیم محمد سعید	۳۵ روپے
۷۔	گندا پانی	محمد ابراہیم شاہ	۵ روپے
۸۔	[illegible] معمولی نزلہ نہیں ہے	حکیم محمد سعید	۱۰ روپے
۹۔	[illegible] ار فکر	حکیم محمد سعید	۳۰ روپے
۱۰۔	[illegible]وں کی کہانی	فرید الدین احمد	۲۰ روپے
۱۱۔	امن	حکیم محمد سعید	۲۰ روپے
۱۲۔	مگرمچھ کے پیٹ میں	اے حمید	۱۰ روپے
۱۳۔	خزانے کا راز	اے حمید	۱۰ روپے
۱۴۔	قبر کا عذاب	اے حمید	۱۸ روپے
۱۵۔	احسان کا بدلہ	میرزا ادیب	۱۰ روپے

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان، ہمدرد سینٹر، ناظم آباد نمبر ۳، کراچی

ایک لڑکی کی عقل مندی

مجھے آج ایک عقل مندی لڑکی کی کہانی یاد آ گئی۔ نونہالو! میں تم کو سناتا ہوں:

ایک بار ایسا ہوا کہ بادشاہ ہارون الرشید شکار کو نکلے۔ ان کو شکار کا اچھا شوق تھا۔ اس شوق میں وہ ایک ویران ریگستان میں جا نکلے۔ ہارون الرشید بادشاہ تھے۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سارے آدمی بھی تھے۔ گرمی شدید تھی۔ ریگستان کی ریت آگ بنی ہوئی تھی۔ سب کا مارے پیاس کے برا حال تھا۔ سب کو پانی کی تلاش تھی۔ مارے مارے پھر رہے تھے۔ وہ سب پانی کی تلاش میں دور دور نکل گئے۔ پھر ایک ایسی جگہ پہنچے کہ جہاں ان کو ایک

خیمہ نظر آیا۔ جان میں جان آئی۔ اس طرف دوڑے، جا کر دیکھا تو عجیب ماجرا تھا!

ایک نہایت خوب صورت لڑکی بیٹھی تھی۔ سینے پرونے میں مصروف تھی۔ اچانک لڑکی نے دیکھا کہ خلیفہ ہارون الرشید اس کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ تو بڑی گھبرائی۔ ادب سے کھڑی ہوگئی اور آداب بجالائی۔ پھر نظریں نیچے کیے احترام سے کہا: ''عالی مرتبت! اس وقت میرے والدِ محترم گھر میں نہیں ہیں۔ لیکن آپ ارشاد فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت بجالاسکتی ہوں؟''

خلیفہ ہارون الرشید تو پیاس کی شدت سے بے حال تھے۔ زبان تک خشک تھی، کہا: ''شائستہ لڑکی! مجھے کچھ نہیں چاہیے، بس ایک پیالہ پانی پینے کو چاہیے۔''

لڑکی نے مرحبا کہا۔ ایک صاف ستھرے پیالے میں پانی بھرا اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا، مگر لڑکی نے اس صاف شفاف پانی میں چند تنکے ڈال دیے تھے۔ بادشاہ کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ ٹھنڈے پانی کا پیالہ جیسے ہی ہاتھ میں آیا، دل چاہا کہ غٹ غٹ پی جائے، مگر تنکے تھے۔ انھیں بچا کر آہستہ آہستہ پانی پیا۔ پھر لڑکی کا شکریہ ادا کیا، کہا: ''نونہال! اللہ تعالیٰ تمھاری عمر دراز فرمائیں۔ پانی ٹھنڈا تھا اور شیریں، مگر اس میں تنکے پڑے ہوئے تھے!''

لڑکی نے نہایت ادب کے ساتھ جواب دیا: ''حضورِ محترم! میں نے تنکے جان بوجھ کر ڈالے تھے، تاکہ گرمی کی شدت اور پیاس کی وجہ سے آپ سارا پانی ایک سانس میں نہ نوشِ جان فرمائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے تو خدانہ کرے، آپ بیمار ہو جاتے۔ گرمی کی شدت اور سخت پیاس میں ٹھیر ٹھیر کر پانی پینا چاہیے۔''

نونہالو! ہارون الرشید لڑکی کی عقل مندی اور احتیاط پر نہایت خوش ہوئے اور اسے کئی ہزار دینار انعام کے طور پر عطا کیے۔ ☆

دنیا کا سب سے لمبا بھارتی بچہ

میرٹھ میں رہنے والی باسکٹ بال کی کھلاڑی سوبتلانہ سنگھ کے ڈھائی سالہ بچے کرن کو دنیا کا سب سے لمبا بچہ قرار دیا گیا ہے۔ کرن کا قد چار فیٹ پانچ انچ ہے، جب کہ اس کی ماں کو بھی ایشیا کی سب سے لمبے قد کی خاتون ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کا قد ۷ فیٹ ۲- انچ اور اس کے شوہر کا قد صرف ۶ فیٹ ۷- انچ ہے۔ کرن کے والد نے اُمید ظاہر کی ہے کہ بہت جلد ان کے خاندان کو دنیا کا طویل القامت (لمبا) خاندان قرار دے دیا جائے گا۔ اس بچے کا قد بارہ سال کے بچے کے برابر ہے اور وہ ڈھائی سال کے بچے کے بجائے پانچ سال کے بچوں سے کھیلتا ہے، کیوں کہ اس کے ساتھ پانچ سالہ بچے بھی قد میں اس سے چھوٹے لگتے ہیں۔ ان بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے کرن خود کو ان کے برابر سمجھتا ہے اور ڈھائی سال کے اس کے ہم عمر بچے اس کو بڑا سمجھتے ہوئے اس سے دور رہتے ہیں۔ ☆

لمبی ناک والا

مسعود احمد برکاتی

یہ آج سے صدیوں پہلے کی بات ہے۔ چین میں ایک ٹینگو جادوگر (بدروح) رہتا تھا، جس کا نام چیراجو تھا۔ اس کی بڑی لمبی ناک تھی، جو ہر وقت سرخ رہتی تھی۔ اگرچہ وہ ایک عام آدمی کی طرح رہتا تھا، لیکن اس کے پاس جادوئی طاقت تھی۔ اس کی پیٹھ پر دو بڑے پر بھی تھے، جن کی مدد سے وہ پرندوں کی طرح فضا میں پرواز بھی کرسکتا تھا اور چند لمحوں میں ایک جگہ سے اُڑ کر دوسری جگہ جا سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اسے اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چیراجو فضا میں اُڑ رہا تھا۔ وہ سمندروں اور پہاڑوں پر سے اُڑتا ہوا جاپان پہنچ گیا اور وہاں پہاڑ حائی پر اُترا، جہاں اس کی ملاقات جاپانی ٹینگو جادوگر جیروب سے ہوگئی۔ دونوں میں دوستی ہوگئی۔ دونوں ایک دوسرے سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ چیراجو شیخی بگھارنے لگا:

"میرے ملک میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے، جو میرے جادو کو زیر کر سکے، یہاں تک کہ بڑا پجاری، جو بہت بڑا جادوگر ہے، وہ بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

جیروب نے اس کی یہ بات سنی تو دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے اس کے پاس جادو کی ایسی ہی طاقت ہو۔ یقیناً یہ ایسا ہی ہوگا، جیسا اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے۔

ادھر جیروب سوچ میں رہا تھا اور دوسری طرف چیراجو اپنی غیر معمولی حیرت انگیز طاقت کے بارے میں ڈینگیں مار رہا تھا۔ جب وہ فخریہ انداز میں اپنی تعریفیں کر رہا تھا، اس وقت اس کی لمبی سرخ ناک بار بار لہرا رہی تھی۔ اس کی بات سن کر جیروب اس کی تعریف کرتے ہوئے بولا: "میں نے بھی تمھارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے، لیکن میں نہیں جانتا کہ واقعی تم ایسے ہی ہو، جیسا بیان کر رہے ہو!"

جب جیروب نے یہ جملہ کہا تو چیراجو اور بھی تن کر بیٹھ گیا اور بڑے فخر سے کہنے لگا:

"میں کیا ہوں اور میری طاقت کتنی ہے، تم اس کا اندازہ اس بات سے کر سکتے ہو کہ جاپان کے سارے جادوگر، پجاری میرے آگے ہیچ ہیں۔ ان میں کوئی بھی میرا ہم پلہ نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے جاپانی ٹینگو جیروب کی طرف دیکھا اور فخریہ انداز بولا: "میرے دوست جیروب! اگر تم نے میرا جادو اب تک نہیں دیکھا تو کیا تم چاہتے ہو کہ تمھیں میں اپنی طاقت دکھاؤں؟ آؤ میرے ساتھ، میں تمھیں اپنے جادو کی طاقت دکھاتا ہوں۔"

جیسے ہی چیراجو نے یہ کہا، جیروب اُٹھ کھڑا ہو گیا اور وہ دونوں چلتے ہوئے جائی پہاڑ کے ایک مصروف علاقے میں آ گئے۔ یہاں آنے کا مقصد یہ تھا کہ چیراجو کسی راہ چلتے آدمی پر جادو کر کے جیروب کو اپنا کمال دکھائے۔ جیروب چوں کہ اس علاقے میں مشہور تھا، اس لیے وہ ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گیا، تاکہ کوئی اسے پہچان نہ سکے۔ اس نے چیراجو سے کہا: "میں درخت کی اوٹ میں چھپ کر دیکھتا ہوں۔"

چیراجو تن کر کھڑا ہو گیا اور کہا: "لو پھر دیکھو، میں کیا جادو دکھاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ ایک بوڑھے بدھ پجاری کے روپ میں بدل گیا۔ یہ روپ اختیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ کسی ایسے آدمی کا انتظار کرے، جس کو وہ اپنا شکار بنا سکے۔ وہ تھوڑی دیر تک وہاں کھڑا کسی کے آنے والے کا انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ اسے ایک آدمی اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ شخص کوئی عام آدمی نہیں تھا، بلکہ ایک مشہور پجاری تھا، جس کا نام یوکئی تھا۔

جیسے ہی جیروب نے اسے دیکھا وہ چیراجو کو مخاطب کرتے ہوئے زور سے چلایا:

"لو وہ آ گیا۔" اور دیکھنے لگا کہ چیراجو اس پر کیا جادو کرتا ہے۔ لمحہ بہ لمحہ وہ آدمی کے قریب آتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ بالکل قریب آ گیا، لیکن اسے کچھ بھی نہیں ہوا۔ یوکئی پجاری اسی طرح چلتا ہوا وہاں سے آگے نکل گیا۔ یہ دیکھ کر جیروب بہت حیران ہوا اور پوچھنے لگا:

"دوست چیراجو! تمھارے جادو کا کیا ہوا؟ پجاری تو آگے نکل گیا۔"

مگر اس کو کوئی جواب نہ ملا۔ اسے اور بھی تعجب ہوا۔ اس نے درخت کی اوٹ

میں سے سر نکال کر نظر دوڑائی تو ہکا بکا رہ گیا۔ وہاں چیراجو کا کہیں اُتا پتا نہیں تھا۔ وہ درخت کی اوٹ سے نکل آیا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو دیکھا کہ دور وادی میں چیراجو ایک بڑے درخت پر لٹکا ہوا جھول رہا ہے۔ جیروب نے اسے اس عالم میں دیکھا تو پکار کر پوچھنے لگا: ''میرے دوست چیراجو! تم وہاں درخت پر لٹکے ہوئے کیا کر رہے ہو؟''

جواب میں درخت پر لٹکے لٹکے چیراجو نے کہا: ''جیروب! مجھے بتاؤ، یہ شخص کون تھا؟''

''یہ ان پہاڑوں کا مشہور پجاری ہے اور اس نام یوکی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم نے درخت پر چکر کھاتے ہوئے اس کا اندازہ کر لیا ہوگا؟''

جب اس نے یہ کہا تو چیراجو بڑبڑانے کے انداز میں بولا: ''اُف میرے خدا، اس نے مجھے شکست دے دی ہے۔ جب میں نے اسے آتے ہوئے دیکھا تھا تو میں یہ سوچ کر خوش تھا کہ میرا شکار آ رہا ہے، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ایک بہت بڑے شعلے میں تبدیل ہو گیا اور میرے قریب آ گیا۔ اس نے مجھ پر آگ کا جادو ایسے پھینکا کہ میں جل گیا۔''

جس وقت چیراجو یہ کہہ رہا تھا، اس کی آواز میں خوف جھلک رہا تھا، لیکن جیروب نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا: ''کوئی بات نہیں، حوصلہ مت ہارو اور اپنا جادو دکھانے کی دوبارہ کوشش کرو۔''

جیروب درخت سے اُتر آیا اور پھر ایک بوڑھے پجاری کا روپ دھار کر ایک درخت کی اوٹ میں چھپ کر کھڑا ہو گیا اور چیراجو بوڑھے بدھ پجاری کی شکل میں راستے میں کھڑا ہو گیا، تا کہ کسی دوسرے آدمی پر جادو کر کے اپنا کمال دکھائے۔ اسے وہاں کھڑے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ یہ آدمی بھی بڑے درجے کا پجاری تھا، جس کا نام جن زین تھا۔ یہ ایک پالکی نما گاڑی میں سوار تھا، جسے ایک خدمت گار لڑکا

کھینچتے ہوئے لا رہا تھا، جس نے ہاتھ میں چھڑی پکڑ رکھی تھی۔ چیراجو اپنے دوسرے شکار کو آتا ہوا دیکھ کر دل میں خوش ہو رہا تھا اور منتظر تھا کہ جیسے ہی وہ قریب پہنچے، اس پر اپنا جادو کرے، مگر جب وہ قریب پہنچا تو گاڑی کھینچنے والے خدمت گار لڑکے نے اس کی طرف دیکھا اور ڈانٹ کر بولا: ''او بدتمیز آدمی! آگے سے ہٹو۔''

اس کا اتنا کہنا کافی تھا۔ جیسے ہی اس نے یہ کہا، ایک بار پھر مغرور چیراجو ہوا میں اُچھلا اور دور فاصلے پر جا گرا۔ پالکی گاڑی میں سوار پجاری اسی طرح آگے بڑھ گیا اور اسے کچھ بھی نہ ہو سکا۔

''پیارے دوست چیراجو! تمھیں پھر شکست ہوگئی۔'' جیروب نے چیراجو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس پر چیراجو اپنی جگہ حیران اور پریشان ہو کر کہنے لگا: ''سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آج میرے ساتھ کیا معاملہ ہے؟ میرے جادو کو کیا ہو گیا ہے؟'' مگر وہ اس قدر ضدی تھا کہ ابھی تک اپنی شکست تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ وہ پوچھنے لگا: ''یہ پالکی گاڑی میں کون سوار تھا؟''

جواب میں جیروب نے بتایا: ''یہ بھی ایک مشہور پجاری تھا، جس کا نام جن زین ہے۔''

یہ سن کر چیراجو آہستہ سے بولا: ''یہ پجاری جو پالکی میں خود کو سویا ہوا ظاہر کر رہا تھا، دراصل عبادت میں مصروف تھا۔ بہر صورت اس کا خدمت گار بھی بڑا طاقت ور تھا اور آگ کے دیوتا کا ماننے والا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میرا جادو ان پر نہیں چل سکا۔''

اتنا کہہ کر اس نے جیروب کی طرف دیکھا اور بڑی ڈھٹائی سے کہنے لگا: ''میں تم سے شرط لگاتا ہوں کہ اس کے بعد جو آئے گا، میں اسے ضرور شکار بنا لوں گا۔''

اور وہ دونوں پھر کسی نئے آنے والے کا انتظار کرنے لگے۔ ابھی زیادہ دیر نہیں

ہوئی تھی کہ اتنے میں ایک جلوس آتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ جلوس پہاڑ حائی پر واقع انیریا کو جی مندر کے بڑے پجاری جیکئی کا تھا۔ بڑا پجاری اپنے عقیدت مندوں کے ہجوم میں گھرا ہوا چلا آ رہا تھا۔ وہ پالکی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا اور لوگ گاڑی کھینچتے ہوئے لا رہے تھے۔ جیکئی جاپان میں بڑی معتبر، قابلِ احترام اور علمی شخصیت تھی۔ جیسے ہی جیروب اس کا جلوس دیکھا، وہ جلدی سے درخت کی اوٹ میں چھپ گیا اور چیراجو بھی چوکنا ہو کر کھڑا ہو گیا، ادھر جلوس آہستہ آہستہ ان کے قریب آ رہا تھا اور پھر جونہی لوگ اس کے پاس پہنچے، ایک عجیب بات ہوئی۔ آناً فاناً پانچ آدمی ظاہر ہوئے، جو غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ جلوس کے لوگ حیران تھے کہ یہ آدمی اچانک کہاں سے آ گئے۔ ان پانچوں کے ہاتھوں میں چھڑیاں تھیں اور انھوں نے ظاہر ہوتے ہی ایک دوسرے کو خبردار کرتے ہوئے کہا: ''ہوشیار ہو جاؤ۔ یہاں کہیں ایک ٹینگو جادوگر گھات میں بیٹھا ہوا ہے، جو ہمارے آقا کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اس پر نظر رکھو اور اسے سزا دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

ان پانچوں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ جیسے ہی ان کی نظر چیراجو پر پڑی، وہ سب کے سب تیزی سے اس کی طرف لپکے۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہوا کہ چیراجو کو وہاں سے بھاگنے تک کا وقت نہ مل سکا۔ اس نے کوشش تو کی، مگر اس سے پہلے کہ وہ فرار ہوتا، اسے ان پانچ آدمیوں نے پکڑ لیا۔ انھوں نے اسے چھڑیوں سے اندھا دھند پیٹنا شروع کر دیا۔ جب وہ اُسے پیٹ پیٹ کر لہولہان کر چکے تو انھوں نے اسے اُٹھا کر اس طرح دور پھینک دیا، جیسے سوکھا ہوا پتا ہوا میں اُڑ جاتا ہے۔ اس کے بعد جلوس جیسے آیا تھا، اسی طرح وہاں سے گزر گیا۔

''اوہ! میں مر گیا۔ مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ!''

چیراجو چیخ چیخ کر مدد کے لیے پکارنے لگا اور پھر جب جیروب اس کے پاس پہنچا تو

وہ بڑبڑاتے، ہانپتے کانپتے کہنے لگا: ''اس مذہبی پیشوا نے یقیناً کوئی دعا پڑھی ہے۔ اس کے پانچ طاقت ور محافظ مہاتما بدھ کے ماننے والے ہیں۔ انھوں نے مجھے اس قدر مارا ہے کہ میری ہڈیاں تک چور ہوگئی ہیں اور میں درد سے مرا جا رہا ہوں۔''

وہ پھر درد سے کراہنے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر جیروب ہنستے ہوئے بولا: ''تم نے اپنی یہ درگت خود بنوائی ہے۔ نہ تم اس طرح شیخی بگھارتے اور نہ تمھاری اس طرح بے عزتی ہوتی، پھر بھی تم خوش قسمت ہو کہ تمھاری لمبی ناک بچ گئی، ورنہ تم اس سے بھی محروم ہو جاتے جو تمھاری پہچان ہے۔''

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد جاپان میں کسی جگہ ایک معدنی چشمے پر دو ٹینگو دیکھے گئے۔ ہمیں یقین ہے، یہ چیراجو اور جیروب ہوں گے جو یقیناً وہاں علاج کے لیے آتے ہوں گے۔

☆☆☆

کروڑ پتی بچیاں

دنیا کی سب سے پہلی کروڑ پتی بچی جیکی کوگان تھی۔ یہ بچی بیس ویں صدی کی تیسری دہائی یعنی ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کے دوران فلموں میں اداکاری کرتی تھی۔

دنیا کی دوسری کروڑ پتی بچی بھی ایک ننھی منی اداکارہ شیرلی ٹیمپل تھی۔ یہ بچی سب سے مشہور اور نام ور ننھی منی اداکارہ ہے۔ اس نے ۱۹۳۰ء کے بعد جب دنیا شدید مشکلات میں پھنسی ہوئی تھی، دس لاکھ ڈالر معاوضہ وصول کیا تھا۔ دس برس کی عمر میں اس نے اداکاری چھوڑ دی تھی۔

مرسلہ: محمد زیرک شکیب، نارتھ کراچی

پیارے ابّا جان

محمد عدنان دانش

رب کا فضل و کرم، والدِ محترم
منفرد اور ممتاز ان کا بھرم

گھر کے ہیں سربراہ، منتظم، معتبر
اپنے بچوں کی رکھتے ہیں پل پل خبر

قلب میں ظرف بھی خوب رکھتے ہیں وہ
اپنے بچوں کو محبوب رکھتے ہیں وہ

پہل کرتے ہیں وہ ہر کسی کام میں
ان کو فارغ نہ دیکھو گے تم شام میں

گھر میں چیزیں وہی لے کے آتے ہیں سب
فائدہ دوسرے پھر اٹھاتے ہیں سب

ہے مجھے فخر کہ ان کی اولاد ہوں
کاش! میں ان کی مانند فولاد ہوں

ان کا دل جیت لوں، ان کو راضی کروں
یعنی محنت سے کردار سازی کروں

علم دریچے

زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے کی عادت ڈالیے اور اچھی اچھی مختصر تحریریں جو آپ پڑھیں، وہ صاف نقل کر کے ہمیں بھیج دیں، مگر اپنے نام کے علاوہ اصل تحریر لکھنے والے کا نام بھی ضرور لکھیں۔

حق دار

مرسلہ: حرا اقبال نوی والا، کراچی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا: ''میں خیرات دینا چاہتا ہوں، لیکن مجھے اندازہ نہیں کہ کون حق دار ہے اور کون نہیں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اس کو بھی خیرات دو، جو حق دار ہے اور اس کو بھی دو، جو حق دار نہیں، تو اللہ تمھیں وہ بھی دے گا، جس کے تم حق دار ہو اور وہ بھی دے گا، جس کے تم حق دار نہیں۔''

حُسنِ سلوک

مرسلہ: سیما ملکہ، سکرنڈ

حضرت مالک بن دینارؒ نے ایک مکان کرائے پر لیا۔ اُن کے پڑوس میں ایک یہودی کا مکان تھا۔ حضرت مالک بن دینارؒ کا حجرہ یہودی کے مکان کے دروازے کے قریب تھا۔ یہودی نے ایک پرنالہ بنا رکھا تھا اور ہمیشہ اس پرنالے کی راہ سے گندگی حضرت مالک بن دینارؒ کے گھر میں پھینکا کرتا تھا۔ یہودی ایک مدت تک اسی طرح کرتا رہا، مگر حضرت مالکؒ نے کبھی اس سے شکایت نہ کی، آخر ایک روز یہودی نے خود ہی حضرت مالک سے پوچھا: ''آپ کو میرے پرنالے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟''

آپ نے فرمایا: ''تکلیف تو نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ میں نے ایک ٹوکری اور ایک جھاڑو رکھی ہوئی ہے، جو گندگی گرتی ہے، اسے صاف کر لیتا ہوں۔''

یہودی نے کہا: ''آپ اتنی تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ آپ کو غصہ نہیں آتا؟''

انھوں نے فرمایا: ''قرآنِ کریم میں میرے رب کا ارشاد ہے کہ جو لوگ غصہ پی لیتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، وہ بڑے اچھے لوگ ہیں۔''

یہ سن کر یہودی نے کہا: ''پھر مجھے کلمہ پڑھائیں۔ جو دین ایسی تعلیم دیتا ہے، وہ دین بھی بڑا اچھا دین ہے۔''

انٹارکٹکا میں پاکستانی پرچم

مرسلہ: رابعہ صلاح الدین، کراچی

۲۵ جنوری ۱۹۹۱ء بروز جمعہ پاکستانی سائنس دانوں کی ایک جماعت نے انٹارکٹکا میں پاکستان کا پرچم لہرایا، جو اس براعظم میں لہرایا جانے والا کسی بھی اسلامی ملک کا پہلا پرچم تھا۔ پرچم کشائی سے پہلے جماعت میں شریک سائنس دانوں نے اذان دی اور پھر سب نے مل کر نمازِ ظہر ادا کی۔ اذان دینے کا فریضہ بھی اس براعظم پر پہلی مرتبہ ادا کیا گیا تھا۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی کے ڈائرکٹر جنرل ابوالفرح کی کوششوں سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ پاکستان انٹارکٹکا میں سائنسی تحقیق اور مشاہدات شروع کرنے والا پہلا اسلامی ملک ہے۔

انصاف

مرسلہ: مہک اکرم، لیاقت آباد

مشہور بادشاہ نوشیرواں عادل بہت انصاف پسند اور نیک بادشاہ تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ نے ایک خوب صورت محل بنانا چاہا تو ایک بوڑھی عورت کی زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی محل کے نقشے میں شامل کرنا پڑا۔ اس ٹکڑے کے نہ ملنے سے محل ٹیڑھا بن جاتا۔ نوشیرواں نے اپنے وزیر کو اس بوڑھی عورت کے پاس بھیجا، تاکہ زمین حاصل کی جا سکے، مگر بوڑھی عورت نے ٹکڑا دینے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے جب یہ سنا کہ بوڑھی کسی قیمت پر بھی ٹکڑا نہیں دیتی تو بادشاہ نے کہا کہ محل ٹیڑھا ہی بنا دیا جائے۔ جب محل بن گیا تو بوڑھی عورت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا: ''بادشاہ سلامت! میری زمین حاضر ہے۔''

بادشاہ نے کہا: ''اے بڑی بی! تم نے

اس وقت کیوں نہ زمین دی جب میں نے
مانگی تھی؟''

بڑھیا نے جواب دیا: ''بادشاہ سلامت!
میں آپ کا رویہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آپ مجھ
غریب عورت کے ساتھ کیا سلوک کریں
گے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اس امتحان
میں کامیاب رہے ہیں۔'' بادشاہ نے جب
یہ سنا تو کہا کہ یہ پورا محل ہی اس بوڑھی
عورت کے نام کر دیا جائے۔

علم کی اہمیت وفضیلت

مرسلہ: محمد وسیم عنایت، سرگودھا

ایک اَن پڑھ آدمی کے گھر ایک جعلی
پیر آیا۔ اس نے اَن پڑھ آدمی سے کہا:
''میں آپ کو ہر چیز ڈگنی کر کے دکھاؤں
گا۔'' اَن پڑھ آدمی فوراً مان گیا۔ اَن پڑھ
آدمی نے سو روپے کا نوٹ دیا اور کہا: ''اس
کو ڈبل کر کے دکھاؤ۔'' جعلی پیر نے سو
روپے جیب میں ڈالے اور الٹا سیدھا منتر
پڑھنے لگا۔ پھر چند منٹ بعد دوبارہ جیب
ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں سو
سو کے دو نوٹ تھے۔ اَن پڑھ آدمی کو یقین
آ گیا کہ یہ پہنچا ہوا بزرگ ہے۔ اَن پڑھ
آدمی لالچ میں آ گیا۔ وہ فوراً گھر سے اپنی
بیوی کا سارا زیور لے آیا۔ جعلی پیر بھی یہی
چاہتا تھا۔ اس نے اَن پڑھ آدمی سے کہا
کہ تمھاری بیوی نے کچھ زیور اپنے پاس
چھپا لیا ہے، جب تک وہ زیور نہیں آتا، اس
وقت تک یہ زیور ڈگنا نہیں ہو سکتا۔ وہ فوراً
گھر گیا اور بیوی سے زیور کے بارے میں
پوچھا، لیکن بیوی نے انکار کر دیا، کیوں کہ
اس نے سارا زیور دے دیا تھا۔ اب اس
کے پاس کچھ نہیں باقی بچا، لیکن اَن پڑھ
آدمی پیر کی باتوں میں آ گیا تھا۔ اس نے
غصے میں آ کر بیوی کو خوب مارا۔ جب وہ
تھک گیا تو پیر کو بتانے کے لیے باہر پہنچا۔
یہ دیکھ کر اس کی جان نکل گئی کہ پیر سارے
زیور لے کر بھاگ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ
پچھتانے لگا۔ اگر وہ پڑھا لکھا ہوتا تو اس

طرح بے وقوف نہ بنتا۔

معلومات پاکستان

مرسلہ: سعدیہ اعجاز ملتانی، کراچی

- پاکستان کا سب سے طویل دریا ''دریائے سندھ'' ہے۔
- پاکستان کا سب سے لمبا مینار ''مینار پاکستان'' ہے۔
- پاکستان کا سب سے بڑا جنگل ''چھانگا مانگا'' ہے۔
- پاکستان میں سب سے طویل سرنگ ''کوجک'' ہے۔

ابنِ شمشیر

مرسلہ: تحریم خاں، بلال ٹاؤن

نادر شاہ نے دلی فتح کر لی تھی۔ مفتوح
مغل بادشاہ محمد شاہ شکست تسلیم کر چکا تھا۔
نادر شاہ نے اس سے عزت و احترام کا
سلوک کیا۔ دونوں میں دوستی ہو گئی۔ دوستی
کو تقویت دینے کے لیے محمد شاہ نے اپنی
بیٹی کی شادی نادر شاہ کے لڑکے نصر اللہ سے
طے کر دی۔ نکاح کے موقع پر دلھن والوں
کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ دولھا کا شجرہ
نسب ساتویں پشت تک سنایا جائے۔ فاتح
نادر شاہ یہ مطالبہ سن کر جلال سے کھڑا
ہو گیا۔ اس نے دولھا کا شجرہ شروع کیا:
''نصر اللہ بن نادر شاہ بن شمشیر بن شمشیر۔''
اس کا کہنا تھا کہ ''نصر اللہ، نادر شاہ کا بیٹا
ہے اور نادر شاہ شمشیر کا۔ اس طرح یہ شجرہ
صرف ساتویں پشت تک نہیں، سترویں
پشت تک جا سکتا ہے۔

دل کو جلاتا ہے

مرسلہ: میمونہ ساجد، سانگھڑ

ایک کنجوس شخص روٹی اور شہد لے کر
کھانے بیٹھا تو عین اسی وقت دروازے پر
کوئی مہمان آ دھمکا۔ کنجوس نے روٹی اُٹھا
کر ایک طرف رکھ دی اور پھر اس سے پہلے
کہ وہ شہد بھی غائب کرتا، مہمان دروازہ
کھول کر اندر آ پہنچا۔ مہمان کے بیٹھ جانے
کے بعد کنجوس نے کہا: ''روٹی کے بغیر آپ

شہد چاٹنا پسند کریں گے؟"

مہمان نے کہا: "کیوں نہیں۔" پھر لپک کر انگلیوں سے شہد چاٹنا شروع کر دیا۔ کنجوس شخص اسے یوں بے دردی سے شہد کا صفایا کرتا دیکھ کر ضبط نہ کر سکا اور بول پڑا: "آپ کو معلوم ہے، خالی شہد دل کو جلاتا ہے۔"

مہمان نے برجستہ جواب دیا: "جی ہاں اگر آپ کے دل کو۔"

قائد کی نصیحت

مرسلہ: محمد ابوبکر وقاص، لودھراں

پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے، ایک مرتبہ قائداعظم محمد علی جناح عربک کالج دہلی میں تشریف لائے۔ وہاں کسی طالب علم نے ان سے شکایت کی کہ ہر جگہ کرسیوں پر بوڑھے بیٹھے نظر آتے ہیں، نوجوان کیا کریں؟

طالب علم کی بات سن کر قائداعظم محمد علی جناح مسکرائے اور کہا: "بیٹے! اپنے آپ کو اس قابل بناؤ کہ بوڑھوں کی کرسیاں ان سے چھین لو۔ اونچا مقام ہمیشہ اہل لوگوں کو ہی ملتا ہے۔"

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مرسلہ: عبدالرافع، کراچی

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ہاتھوں ۹۰ لاکھ غیر مسلم دولت ایمان سے سرفراز ہوئے۔ آپ نے اجمیر کے راجہ پرتھوی راج کو بھی دعوت اسلام دی۔ بجائے اس کے راجہ ایمان لاتا، وہ آپ کا دشمن ہوگیا اور خواجہ چشتی کو اجمیر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ آپ یہ پیغام سن کر مسکرائے اور کہا وقت بتائے گا کہ اجمیر سے میں نکلتا ہوں یا راجہ ذلیل و خوار ہوتا ہے۔

اس واقعے کے چند ہی روز بعد حضرت خواجہ نے سلطان شہاب الدین غوری کو خواب میں اپنی زیارت کرائی اور بشارت دیتے ہوئے کہا: "خراسان سے جلد از جلد ہندستان آ، اجمیر کی حکومت تیرا انتظار کر رہی ہے۔" یہ بشارت سنتے ہی سلطان غوری نے ایک لاکھ بیس ہزار کا لشکر تیار کیا اور اجمیر پر حملہ کر کے راجہ پرتھوی راج اور اس کی ۳ لاکھ فوج کو اپنے جذبۂ ایمانی کی تلوار سے کاٹ دیا۔ یوں خواجہ معین الدین کی پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ہوئی۔

فرینکفرٹ کا غسل خانہ

مرسلہ: صائمہ اورنگزیب، ہزارہ

فرینکفرٹ (جرمنی) میں پہلے روز ہم نے غسل خانے جانا چاہا تو اس کا دروازہ ہی نہ ملا۔ ہم نے منیجر کو بلا کر کہا: "بھلے مانس! کہاں ہے غسل خانے کا دروازہ؟" اس نے کہا: "کہیں بھی نہیں ہے، کیوں کہ آپ کے کمرے کے ساتھ غسل خانہ نہیں ہے۔" اس پر ہم نے ہوٹل والوں سے کہا: "ہمیں غسل خانہ چاہیے۔ اس کے ساتھ کمرا ہو یا نہ ہو کچھ پروا نہیں، کیوں کہ ہم غسل خانے کے تخت طاؤس پر بیٹھے بیٹھے غور و فکر کرتے ہوئے وقت گزار لیں گے۔" منیجر کے جی میں نیکی آئی تو اس نے اگلے روز ہمیں ایک غسل خانہ دے دیا اور اس کے ساتھ ملحقہ ایک کمرا یعنی بیڈ روم بھی۔ (ابنِ انشا)

اقوالِ زریں

مرسلہ: ثوبیہ جمال، کراچی

☆ حسد ایک ایسا آلہ ہے جو انسان کو اندر اور باہر سے ختم کر دیتا ہے۔

☆ سچائی ایک ایسی دوا ہے، جس کی لذت کڑوی، مگر تاثیر شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔

☆ ذہانت ایک ایسا نادر پودا ہے جو محنت کے بغیر پھل نہیں دیتا۔

☆ اہلِ کمال علم اور عمل دونوں کو جمع کرتے ہیں۔

☆ انسان کی پہچان اس کے اخلاق سے ہوتی ہے۔

☆ صبر ایک ایسی سواری ہے جو سوار کو کبھی گرنے نہیں دیتی۔

☆ بھروسا اس مالا کی مانند ہے جس کا ایک موتی ٹوٹ جائے تو ساری مالا بکھر جاتی ہے۔

☆☆☆

ہنسی گھر

◉ ایک دکان پر بورڈ لگا تھا، جس پہ لکھا ہوا تھا: ''اُدھار صرف ۸۰ سال کی عمر سے بڑے لوگوں کو دیا جائے گا، وہ بھی ان کے والدین سے پوچھ کر۔''

مرسلہ: رافعہ خالد، کراچی

◉ استاد، شاگرد سے: ''بتاؤ، وہ کون سا مقام ہے، جہاں بھائی بھائی کو، باپ بیٹے کو اور دوست دوست کو بھول جاتا ہے؟''

شاگرد: ''جناب! شادی ہال، کھانا کھلنے پر۔''

مرسلہ: سید محمد عباس، کراچی

◉ ایک شخص نے ایک راہگیر سے پوچھا: ''بھائی صاحب! پی سی او (پبلک کال آفس) کہاں ہے؟''

راہگیر نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ سامنے ہے۔

وہ شخص پی سی او کے اندر گیا۔ اپنی جیب سے موبائل نکال کر فون کیا اور باہر آ گیا۔

راہگیر یہ دیکھ کر حیران ہوا اور پوچھا: ''تم نے پی سی او میں جا کر اپنے موبائل سے فون کیوں کیا؟''

اُس شخص نے جواب دیا: ''میرے دوست نے کہا تھا کہ پی سی او سے فون کرنا، پیسے کم لگیں گے۔''

مرسلہ: فضیلہ ذکاء بھٹی، شیخوپورہ

◉ ملازمت کے اُمیدوار سے کمپنی کے ڈائرکٹر نے پوچھا: ''آپ کے پاس سابقہ ملازمتوں کے سرٹیفکیٹ ہیں؟''

اُمیدوار نے جواب دیا: ''نہیں جناب! میں نے سب کے سب پھاڑ دیے ہیں۔''

ڈائرکٹر نے کہا: ''یہ تو آپ نے بہت بڑی بے وقوفی کی ہے۔''

اُمیدوار بولا: ''نہیں جناب! اگر آپ انھیں پڑھ لیتے تو آپ کی یہ رائے نہ ہوتی۔''

مرسلہ: بریرہ خالد، لاہور

◉ مونا (مونی سے): ''مونی! تم اس مرتبہ نانی اماں کو سال گرہ کے موقع پر کیا تحفہ دو گے؟''

مونی: ''فٹ بال۔''

مونا (حیرت سے): ''نانی اماں بھلا فٹ بال کا کیا کریں گی؟''

مونی: ''پچھلے سال نانی اماں نے بھی تو میری سال گرہ پر مجھے کتابوں کا تحفہ دیا تھا۔''

مرسلہ: شاداب ریاض، کراچی

◉ فقیر: ''کیا آپ مجھے ایک روپیہ دے سکتے ہیں؟''

آدمی: ''ہٹے کٹے ہو کر بھی بھیک مانگتے ہو۔ تمھیں تو عقل کی ضرورت ہے۔''

فقیر: ''جناب! میں آپ سے صرف وہ مانگ رہا ہوں، جو آپ کے پاس ہے۔''

مرسلہ: مسعود اعجاز ملتانی، کراچی

◉ ایک آدمی کا سر پھٹ گیا۔ ڈاکٹر نے پوچھا: ''یہ کیسے ہوا؟''

آدمی بولا: ''میں جوتے میں کیل ٹھونک رہا تھا۔ ایک آدمی نے کہا کہ سردار جی! کھوپڑی کا استعمال کرو۔''

مرسلہ: ماہین نوید احمد، کراچی

◉ مالک، ملازم سے: ''آج میرے لیے تم جو پانی لائے تھے، وہ بہت میلا تھا۔''

ملازم: ''شیو کا پانی؟ جناب! میں تو آپ کو چائے کا پیالہ دے کر گیا تھا۔''

مرسلہ: ہلال موسیٰ بلوچ، دشت کوہک

◉ ڈاکٹر: ''مبارک ہو! آپ کے کان کا آپریشن کام یاب رہا۔''

مریض: ''کیا کہا ڈاکٹر صاحب! ذرا اونچا بولیے۔''

مرسلہ: نیہا حماد، لاہور

◉ ایک پروفیسر صاحب بال کٹوانے کے لیے بیٹھے تو حجام نے پوچھا: ''جناب! بال کیسے کاٹوں؟''

پروفیسر صاحب: ''بالکل خاموشی سے۔''

مرسلہ: عفان شعیب، کراچی

◉ بیٹا، ابا جان سے: ''سورج زمین سے کتنے فاصلے پر ہے؟''

باپ: ''پتا نہیں۔''

بیٹا: ''پتا آپ کو نہیں، کل اسکول میں سزا مجھے ملے گی۔''

مرسلہ: شاہ زیب اسلم، حسین آباد

◉ وکیل (اپنے موکل سے): ''اچھا تو تم مجھے اپنا وکیل مقرر کرنا چاہتے ہو۔ کتنی فیس دو گے؟''

www.PakSociety.com

موکل: "میرے پاس ایک خچر، چند مرغیاں اور دو بھیڑیں ہیں، وہ آپ کی نذر کردوں گا۔"

وکیل: "کافی ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ تم پر الزام کن چیزوں کی چوری کا لگایا گیا ہے؟"

موکل: "صرف ایک خچر، چند مرغیوں اور دو بھیڑوں کی چوری کا۔"

مرسلہ: زین العابدین، اوتھل

◉ استاد خالد سے: "خالد! تم اتنے غیر حاضر کیوں رہتے ہو؟"

خالد: "آپ نے خود ہی کہا تھا کہ قدر کھو دیتا ہے ہر روز کا آنا جانا، اس لیے میں اکثر غیر حاضر رہتا ہوں، تاکہ آپ کی نظروں میں میری قدر کم نہ ہو۔"

مرسلہ: نبیلہ قمر، نمرہ علی، اوتھل

◉ ڈاکٹر، مریض سے: "اب آپ ٹھیک ہیں اور خطرے سے باہر ہیں تو ڈر کیوں رہے ہیں؟"

مریض: "جس ٹرک سے میں ٹکرایا تھا، اس پر لکھا تھا: "پھر ملیں گے۔""

مرسلہ: ثمن ندیم، کراچی

◉ قاتل: "کوشش کرنا کہ عمر قید ہو، پھانسی نہ ہو۔"

وکیل: "تم فکر ہی نہ کرو۔"

قاتل (فیصلے کے بعد): "کیا ہوا؟"

وکیل: "بہت مشکل سے عمر قید ہوئی ہے، عدالت تو رہا کر رہی تھی۔"

مرسلہ: حیدر کمال علی، میر پور خاص

◉ باپ (بیٹے سے): "بیٹا! تم نے کل رات کو کتنے بجے تک پڑھائی کی؟"

بیٹا: "جی میں بارہ بجے تک پڑھتا رہا۔"

باپ: "لیکن بیٹا! نو بجے تو لائٹ چلی جاتی ہے۔"

بیٹا کچھ سوچنے کے بعد بولا: "میں پڑھنے میں اتنا گم رہا کہ لائٹ جانے کا پتا ہی نہیں چلا۔"

مرسلہ: وجیہہ الطاف، کراچی۔

◉ ایک شیخی خور (دوسرے شیخی خور سے) "تم نے بحیرۂ ہند کا نام سنا ہے؟"

دوسرا: "ہاں سنا ہے۔"

پہلا: "اسے میرے ابو نے ہی تو کھودا تھا اور اس کی مٹی ہمالیہ پہاڑ بن گیا۔"

دوسرا: "تم نے بحرِ مردار کا نام سنا ہے؟"

پہلا: "ہاں۔"

دوسرا: "اسے میرے دادا نے ہی مارا تھا۔"

مرسلہ: محمد ریان عمران، دستگیر

◉ مینیجر نے ملازمت کے امیدوار سے پوچھا: "تمھارا تجربہ؟"

جواب ملا: "پانچ سال۔"

مینیجر خوش ہو کر: "خوب، پہلے کہاں کام کرتے تھے؟"

امیدوار بولا: "کہیں بھی نہیں۔"

پوچھا گیا: "تو پھر پانچ سال کا تجربہ کس چیز کا ہے؟"

جواب ملا: "درخواستیں اور انٹرویو دینے کا۔"

مرسلہ: ایمان آصف، کراچی

◉ پہلا دوست: "اگر میں مر جاؤں تو تم کیا کرو گے؟"

دوسرا دوست: "میں بہت زیادہ روؤں گا۔"

پہلا دوست: "تم مجھے رو کے دکھاؤ۔"

دوسرا دوست: "پہلے تم مر کے دکھاؤ۔"

مرسلہ: محمد اکبر جاوید سرکانی، ڈیرہ غازی خان

◉ ماں: "بیٹا! تم آج اس طرح رُک رُک کر کیوں چل رہے ہو؟ کیا پاؤں میں تکلیف ہے؟"

بیٹا: (معصومیت سے) "نہیں اماں! آپ نے کل ہی کہا تھا کہ مجھے ابھی سے سوچ سمجھ کر قدم رکھنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔"

مرسلہ: واجد نگینوی، کراچی

◉ ایک آدمی کو ڈرپ لگی۔ جب ڈرپ ختم ہو گئی تو اس نے اپنے بھائی سے کہا کہ سسٹر (نرس) کو بلا لاؤ۔"

وہ فوراً گیا اور تین دن بعد گاؤں سے اپنی بہن کو لے آیا۔

مرسلہ: بشریٰ غفار، اوکاڑہ

◉ فقیر نے ایک خاتون کو روک کر کہا: "اللہ کے نام پر ایک روپیہ دے دو، ورنہ مجھے ایک خوف ناک کام کرنا پڑے گا، جس کے خیال سے ہی میری روح کانپ جاتی ہے، رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔"

خاتون نے دہشت زدہ ہو کر فقیر کو ایک روپیہ دے دیا اور ڈرتے ہوئے پوچھا: "بتاؤ، وہ کون سا خوف ناک کام ہے؟"

فقیر نے جواب دیا: "محنت مزدوری۔"

مرسلہ: سرمد خالد، کراچی

◉ بیٹا، باپ سے: "مینیجر کسے کہتے ہیں؟"

باپ، بیٹے سے: "نالائق! اتنا بھی نہیں پتا۔ لا میری ڈکشنری، میں بتاؤں۔"

مرسلہ: عبداللہ احمد، شمالی ناظم آباد

☆☆☆

پیڑ بچائیں

کرشن پرویز، انڈیا

آؤ بچو! پیڑ لگائیں ہم اپنا ماحول بچائیں

دُکھ سہ کر بھی جھومتے گاتے ہم پر خوشیاں خوب لٹاتے

گرمی سردی بارش سہتے پھر بھی لب سے کچھ نہیں کہتے

کیسے کیسے پھل دیتے ہیں ہم کو ہوا اور جل دیتے ہیں

ان پہ پرندے گھر ہیں بناتے صبح سویرے راگ سناتے

ہم اُن کے احسان بھلاتے کاٹ کے ہم ہیں پیڑ جلاتے

بات تمھیں پرویز بتائیں
پیڑ ہیں نعمت ، انھیں بچائیں

باپ کی نصیحت

کہانی: پروفیسر محمد رفیع

ترجمہ: ابراہیم سعد

یہ ایک چھوٹے سے لڑکے کا قصہ ہے، جو بہت بد دماغ تھا۔ اس کے باپ نے اسے کیلوں کا ایک تھیلا دیا اور کہا: ’’جب تمھیں غصہ آئے تو لکڑی کے اس تختے پر ایک کیل ٹھونک دینا۔‘‘

لڑکے نے پہلے دن ۳۷ کیلیں تختے پر میں ٹھونکیں۔ اگلے چند ہفتوں میں اس نے اپنے غصے پر قابو پانا سیکھا تو کیلیں ٹھونکنے کی تعداد روز بروز کم ہوتی گئی۔ لڑکے کو پتا چلا کہ کیلیں ٹھونکنے سے زیادہ آسان کام غصے پر قابو پانا ہے۔ آخر وہ دن بھی آ گیا، جب لڑکے نے دن بھر ایک مرتبہ بھی غصہ نہیں کیا۔ یہ بات لڑکے نے باپ کو بتائی۔ باپ نے لڑکے سے کہا: ’’اب ہر کیل اس دن نکالو، جس دن تمھیں غصہ نہ آئے۔‘‘

دن گزرتے گئے۔ آخر ایک دن وہ آ گیا، جب لڑکے نے باپ سے کہا: ’’اب کوئی کیل باقی نہیں ہے۔‘‘

باپ نے بچے کا ہاتھ پکڑا اور تختے کی طرف لے گیا۔ باپ نے کہا: ’’میرے بیٹے!

تم نے بہت اچھی بات کی ہے، لیکن اس تختے پر ذرا کیلوں کے نشان تو دیکھو۔ یہ تختہ اب پہلے جیسا صاف نہیں رہا۔ جب تم غصے میں کوئی بات کہتے ہو تو وہ اسی طرح اپنا نشان چھوڑ جاتی ہے۔ تم ایک آدمی کو چاقو گھونپ سکتے ہو اور پھر نکال سکتے ہو۔ اب تم کتنا ہی پچھتاوا ظاہر کرو، زخم تو موجود رہے گا۔ زبان کا زخم بھی اتنا ہی گہرا ہوتا ہے جتنا ہتھیار کا۔“

خوش اخلاقی، ادب، شائستگی سے محبت اور شفقت پیدا ہوتی ہے، جو نہ صرف آپ کے کردار کو طاقت بخشتی ہے بلکہ دوسروں کو بھی آپ کی زندگی کی خوبیاں سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

لڑکے نے باپ سے وعدہ کیا کہ وہ آیندہ کبھی غصہ نہیں کرے گا اور ساری زندگی خوش اخلاقی کا دامن تھامے رہے گا۔ ☆

ڈاکو کا نوکر

نظارت نصر

کسی ملک پر ایک بہت عقل مند بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے ملک میں بڑی خوش حالی، امن، چین اور سکون تھا۔ لوگ بہت پُرسکون زندگی گزارتے تھے۔ بادشاہ اپنی رعایا کا بہت خیال رکھتا تھا اور رعایا بھی بادشاہ سے بہت محبت کرتی تھی، مگر کچھ عرصے کے بعد ملک میں چوریاں ہونے لگیں۔ بادشاہ کو جب اطلاع ملی تو وہ بہت فکر مند ہوا۔ اس نے اپنے وزیر کو بلا کر حکم دیا کہ جلد سے جلد ان چوروں کا سراغ لگا کر، انھیں گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کرو، تاکہ ملک میں امن و امان بحال ہو۔ وزیر نے فوراً حکم پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ وہ بھیس بدل کر گلی کوچوں میں پھرنے لگا، تاکہ چوروں کا پتا چلا سکے، مگر شام تک اسے کہیں سے بھی چوروں کے متعلق کوئی خبر نہ مل سکی۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے

فیصلہ کیا کہ وہ رات کو بھی باہر ہی گھومتا رہے گا۔ اس طرح اگر چور کسی گھر میں چوری کرنا چاہیں گے تو اسے پتا چل جائے گا۔ وہ ساری رات ایک گلی سے دوسری گلی میں گھومتا رہا، مگر چور اُسے کہیں نظر نہ آئے۔ صبح جب وہ تھکا ہارا دربار میں پہنچا تو یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوا کہ ایک بڑھیا بادشاہ کے سامنے رو رو کر چوروں کی کارستانی بیان کر رہی تھی، جو رات میں اس کی بھینس اور تین بکریاں چوری کر کے لے گئے تھے۔ بڑھیا فکر مند تھی کہ اب وہ زندگی کیسے گزارے گی۔

بادشاہ نے حکم دیا: ''شاہی خزانے سے بڑی بی کو ایک بھینس اور تین بکریوں کی قیمت ادا کی جائے۔''

پھر وہ وزیر کی طرف متوجہ ہوا اور چوروں کے متعلق دریافت کیا۔ وزیر نے شرمندگی سے کہا: ''بادشاہ سلامت! میں معافی چاہتا ہوں۔ میں ساری رات گلیوں میں پھرنے کے باوجود چوروں کا کوئی سراغ نہیں لگا سکا۔''

بادشاہ وزیر کی بات سن کر سوچ میں ڈوب گیا، پھر اس نے اعلان کیا کہ کل سے ہم دربار میں نقاب لگا کر بیٹھا کریں گے۔ درباری حیران تو ہوئے مگر کسی نے بادشاہ سے اس فیصلے کی وجہ دریافت نہیں کی۔ دربار برخاست ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ نے اپنے وزیر کو بلایا اور کہا: ''دیکھو! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم خود چوروں کی تلاش میں نکلیں۔ تم ہماری غیر موجودگی میں نقاب پہن کر بادشاہ بن کر ملکی امور چلاتے رہنا۔ ہمیں امید ہے کہ ہم جلد ہی چوروں کا سراغ لگا لیں گے۔''

وزیر، بادشاہ کی ہدایت کے مطابق نقاب پہن کر امورِ مملکت چلانے لگا اور بادشاہ ایک غریب کسان کے روپ میں گلیوں بازاروں میں چوروں کو تلاش کرنے لگا۔ بادشاہ ہر روز ایک نیا بھیس بدل کر چوروں کی تلاش میں نکلتا مگر اسے چوروں کی تلاش

میں کوئی کام یابی نہ ہوئی۔ ایک رات کو بادشاہ نے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنی تو وہ ان کے تعاقب میں جانے لگا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ گھڑ سوار شہر سے نکل کر جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ بادشاہ کے پاس گھوڑا نہیں تھا۔ وہ ان کا پیچھا نہیں کر سکتا تھا، مگر اسے یقین ہو گیا کہ یقیناً وہی چور تھے جو روزانہ کسی نہ کسی گھر میں چوری کرتے تھے مگر پکڑے نہیں جاتے تھے۔

اگلے دن بادشاہ نے جنگل کا رخ کیا۔ بہت دیر تک چلتے رہنے کے بعد وہ جنگل کے وسط میں پہنچ گیا۔ اب اسے چوروں کے ٹھکانے کی تلاش تھی۔ وہ جنگل میں ادھر اُدھر گھوم رہا تھا کہ اچانک ایک مسلح چور نے اسے روک کر پوچھا: ''تم اس جنگل میں کیوں گھوم رہے ہو اور کون ہو؟''

بادشاہ نے کہا: ''میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میرا کوئی گھر نہیں، اس لیے جنگل

میں گھوم رہا ہوں۔''

چور نے کہا: ''میں تو تمھیں ابھی قتل کر دیتا مگر سردار کے آنے تک تمھیں زندہ رکھوں گا، کیوں کہ یہ سردار کا حکم ہے۔'' بادشاہ کو اس نے ایک درخت سے باندھ دیا۔ شام کو جب چوروں کا سردار نئی چوری کے لیے جانے لگا تو وہاں سے گزرا جہاں بادشاہ کو درخت سے باندھا گیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے درخواست کی کہ مجھے اپنے ہاں نوکر رکھ لو۔ سردار نے چند لمحے سوچا، پھر بولا: ''ٹھیک ہے۔ میں تمھیں ایک شرط پر نوکری دے سکتا ہوں کہ تم ہم سے کوئی سوال نہیں کرو گے اور کبھی اس جنگل سے باہر نہیں نکلو گے۔''

بادشاہ نے دونوں شرطیں منظور کر لیں اور اس طرح وہ چوروں کا ساتھی بن گیا۔

اب بادشاہ ان کے کھانا پکاتا، ان کے غار کی صفائی کرتا، چشمے پر لے جا کر ان کے کپڑے دھوتا اور پینے کے لیے پانی بھر کر لاتا، مگر ان سے کوئی سوال نہ کرتا۔ چور اس کے سامنے چوری کرنے جاتے، وہ واپس آ کر مال آپس میں تقسیم کرتے اور سو جاتے، مگر بادشاہ انھیں کچھ نہ کہتا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ ایک چور سارا دن بادشاہ کی چھپ چھپ کر نگرانی کرتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد چوروں کو بادشاہ پر اعتماد ہو گیا۔ تب ایک دن بادشاہ نے چوروں کے سردار سے کہا کہ مجھے چٹائیاں بنانے کا فن آتا ہے۔ اگر تم کہو تو میں تمھارے لیے ایک ایسی شان دار چٹائی بنا دوں، جس پر بادشاہ تمھیں بہت سا انعام دے گا۔ چوروں کے سردار نے بادشاہ کو چٹائی بنانے کی اجازت دے دی۔ بادشاہ نے دن رات ایک کر کے ایک ہفتے میں چٹائی تیار کر لی اور باندھ کر سردار کے حوالے کر دی اور تاکید کی کہ اسے بادشاہ کے سامنے ہی کھولنا۔ اگر تم اسے پہلے ہی کھول لو گے تو اس کے پھول پتے آپس میں گڈمڈ ہو جائیں گے۔ سردار نے بادشاہ کی بات مان لی اور وہ چٹائی لا کر نقاب پوش بادشاہ کو تحفے میں دے دی۔ وزیر نے چٹائی کھول کر دیکھی تو فوراً نوکروں کو حکم دیا کہ اس شخص کو

شاہی مہمان خانے میں ٹھیرایا جائے۔ ہم اسے شایانِ شان انعام دیں گے۔ سردار یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وزیر نے سپاہیوں کے ایک دستے کو تیار ہونے کا حکم دیا اور دستے کے امیر کو بلا کر ایک نقشہ سمجھایا کہ فلاں جنگل میں حملہ کر کے جتنے چور ہیں، سب کو پکڑ لاؤ۔ اگلی صبح جب سردار اپنا انعام لینے دربار میں آیا تو یہ دیکھ حیران رہ گیا کہ اس کے سب ساتھی گرفتار ہو کر بادشاہ کے سامنے پہنچ چکے تھے، مگر ان کے ساتھ وہ غریب نوکر نہیں تھا۔ سردار کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ تب بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ سب چور حیران رہ گئے کیوں کہ وہ ان کا وہی نوکر تھا۔ بادشاہ نے چوروں کو قید کر دینے کا حکم دیا اور لوٹا ہوا مال اصل مالکوں کو واپس کر دیا۔ چوروں کو معلوم ہی نہ ہو سکا کہ دراصل بادشاہ نے چٹائی میں چوروں کی غار کے راستے کا نقشہ بنا کر اپنے نقاب پوش وزیر کو بھیجا تھا اور وزیر نے فوراً وہاں حملہ کروا کر سب چوروں کو گرفتار کر لیا تھا۔ ☆

آمدنی اور خرچ

آمدنی پانچ حرفی لفظ ہے۔

آ + م + د + ن + ی = آمدنی

جب کہ خرچ تین حرفی لفظ ہے۔

خ + ر + چ = خرچ

عقل مندی اور سمجھ داری کا تقاضا یہ ہے کہ اگر آمدنی پانچ رپے ہے تو خرچ تین رپے ہونا چاہیے۔

اور دو رپے بچت کرنی چاہیے، تا کہ آپ کبھی کسی کے محتاج و مقروض نہ ہو سکیں اور ایک باوقار زندگی گزاریں۔

مرسلہ: لبنیٰ سعدیہ، عزیز آباد

عظیم جاپانی قوم

غلام حسین میمن

براعظم ایشیا میں واقع جاپان کو اُبھرتے سورج کی سرزمین کہا جاتا ہے، کیوں کہ ایشیا میں سورج سب سے پہلے یہیں طلوع ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کبھی جاپان کا ڈاک ٹکٹ دیکھنے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ اس پر ''NIPPON'' لکھا ہوا ہے۔ جاپانی زبان میں اس کا مطلب اُبھرتے سورج کی زمین ہے۔

حال ہی میں جاپان میں شدید زلزلہ اور سونامی (سیلاب) آیا۔ پوری جاپانی قوم نے جس ہمت اور جواں مردی سے اس زلزلے اور سیلاب کو برداشت کیا، وہ قابلِ تعریف ہے۔ جاپانی قوم کی اس ثابت قدمی میں دوسری اقوام کے لیے بھی ایک اچھا سبق موجود ہے۔

جاپان میں آئینی بادشاہت ہے۔ یہ ایشیا کی سب سے بڑی صنعتی مملکت بھی ہے، جو چار بڑے جزائر ہوکیڈو، ہونشو، کیوشو اور شکوکو سمیت متعدد چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل ہے۔ دارالحکومت اور سب سے بڑا شہر ٹوکیو ہے۔ دیگر بڑے شہروں میں اوساکا، یوکوہاما، نگویا، کیوٹو، کوبے اور کاواساکی شامل ہیں۔ یہاں جاپانی زبان بولی جاتی ہے اور سکہ ین کہلاتا ہے۔

شہید حکیم محمد سعید جاپان کو بے حد پسند کرتے تھے۔ انھوں نے نونہالوں اور نوجوانوں کے لیے کئی سفرنامے لکھے۔ نومبر ۱۹۹۵ء کے سفر کا حال انھوں نے نوجوانوں کے لیے لکھے گئے سفرنامے ''جاپان کی کہانی'' میں تفصیلاً تحریر کیا ہے، جو ان کا نونہال ادب کے لیے لکھا جانے والا طویل سفرنامہ ہے۔ اس میں ۳۶۲ صفحات ہیں۔

اس سفرنامے میں انھوں نے وہاں کے حالات واقعات، مراکز طب و صحت، خاص تہوار اور کئی پہلوؤں کی سیر کرائی ہے، اور ہاں، وہ ہمیں نئی سائنس اور آرٹ میوزیم میں

بھی لے کر گئے ہیں۔ انھوں نے کتاب میں دل چسپ رنگین تصاویر بھی شامل کی ہیں۔ اس سفر نامے سے ہمیں جاپانی قوم کے بارے میں حالات تفصیل کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ ایک جگہ حکیم محمد سعید شہید تحریر فرماتے ہیں:

''جاپان، چین اور کوریا اقوام زرد کی تعریف میں آتے ہیں۔ چودہ سو سال قبل ریاست مدینہ نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ جب اسلام کم زوریوں کا عنوان بنے گا تو اقوام زرد عروج پائیں گی اور اس کا عروج بھی بالآخر عظمت و رفعت اسلام کا عنوان بنے گا۔ ریاست مدینہ سے بلند کی ہوئی یہ آواز صدا بہ صحرا نہیں رہی ہے۔''

جاپانی کھانے اور رسم و رواج کے بارے میں ایک اور جگہ حکیم صاحب نے لکھا ہے:

''جاپان کے روایتی کھانے میں چاول، ترکاری، سویا بین کا سوپ، اچار یا مچھلی کا گوشت ہوتا ہے۔ جاپانی کھانے میں تازہ چیزیں استعمال کرتے ہیں اور کھانا بہت احتیاط سے پکاتے ہیں۔ نوڈلز جاپانیوں کی پسندیدہ غذا ہے۔ سبز چاے تو جاپان میں سب سے زیادہ پسند کی جاتی ہے۔ جاپان کے روایتی فن مارشل آرٹ، جوڈو کراٹے اور کینڈو اب بھی مقبول ہیں۔ سوموکشتی جاپانیوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔ بیس بال، باسکٹ بال، ٹینس اور فٹ بال بھی کھیلے جاتے ہیں۔ پھولوں کی سجاوٹ ''اکی بانا'' کا طریقہ بھی پانچ سو سال پرانا ہے۔ پھولوں کو سجانے کے مختلف طریقے ہیں۔ جاپانی خاص خاص موقعوں پر اپنا روایتی لباس ''کیمونو'' پہننا پسند کرتے ہیں۔ کیمونو پہننا ذرا مشکل کام ہے اور لڑکیوں کو اس کی باقاعدہ مشق کرنا پڑتی ہے۔ جاپان میں تین قسم کے روایتی تھیٹر ہیں۔ ایک نوہ، دوسرا کابوکی اور تیسرا بن راکو۔ بن راکو ایک قسم کا پتلی تماشا ہے۔ جاپانی بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں۔ میز بانی کے آداب سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ مہمان کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ مہمان کو سہولت اور آسانی فراہم کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔''

حکیم محمد سعید شہید اپنی کتاب ''شاہراہ زندگی'' کے ایک مضمون ''طالب علم بنیے'' میں ایک جاپانی کتے کی وفاداری کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

''نواح ٹوکیو میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس کے اسٹیشن سے باہر نکل کر سامنے [illegible] میں ایک کتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ وہ اپنے مالک کو ہر صبح ٹوکیو جانے والے ٹرین پر سوار کراتا تھا اور ہر شام اسے لینے کے لیے وہاں موجود ہوتا تھا۔ ایک دن اس کا مالک ٹوکیو میں حادثے کا شکار ہو کر چل بسا اور اس شام مقررہ ٹرین سے گھر نہ لوٹ سکا۔ وفادار کتا اس شام بھی اسٹیشن پر اپنے مالک کو لینے آیا اور پھر جو اس کے انتظار میں بیٹھا تو مرتے دم تک اس نے وہ جگہ نہیں چھوڑی۔ قصبے کے لوگ کتے سے واقف تھے۔ اس کے مالک کی موت سے آگاہ تھے۔ ان کی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ کتا اپنی جگہ سے نہیں ہلا، یہاں تک کہ مالک کے انتظار میں وہیں مرگیا۔ لوگوں نے اس کی یاد میں اس کا مجسمہ چوک میں نصب کر دیا۔ غور کیجیے تو یہاں اہمیت مجسمے کی نہیں اس مقصد کی ہے، جس کی خاطر کتے نے جان دی۔''

امریکا نے دوسری جنگ عظیم کے دوران ۶- اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کے شہر ہیروشیما اور تین دن بعد ۹- اگست ۱۹۴۵ء کو دوسرے بڑے شہر ناگاساکی پر ایٹم بم برسا کر ہزاروں انسانوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ جاپانی قوم نے اپنے بزرگوں کی اس تباہی سے یہ سبق سیکھا کہ وہ دنیا کی تمام قوموں اور انسانوں کے لیے اپنی دولت اور خزانوں کے منھ کھول دیں گے، جہاں غربت اور جہالت ہوگی۔ جاپان آج بھی دنیا بھر کے اُن چند ملکوں میں شمار ہوتا ہے جو غریب ملکوں کے عام انسانوں کی ترقی کے لیے اربوں ڈالر امداد اپنے خون پسینے کی کمائی سے دیتا ہے۔ دنیا کے جس ملک نے بھی ایٹم بم بنانے کا سوچا، یہ جاپانی وہاں ڈالروں کی بوریاں لے کر گئے اور ہاتھ جوڑ کر درخواست کی کہ تعلیم

اور غربت پر توجہ دو، خدارا، انسانیت پر بم بنا کر ظلم نہ کریں۔ اپنے بچوں پر رحم کریں۔ کچھ نہیں تو ہماری تباہی کی نمایش میں لگنے والی تصاویر ہی دیکھ لیں۔

جاپان کے حالیہ زلزلے کے وقت ایک پاکستانی صحافی وہاں موجود تھا۔ اس نے اس وقت کے خوف اور زلزلے کی تباہی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''میں نمازِ جمعہ کی ادائی کے بعد دفتر میں روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھا کہ اچانک آفس میں موجود ہر چیز تیزی سے ہلنا شروع ہو گئی۔ اس کے بعد کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی، سوائے کلمے کے ورد کے۔ زلزلہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں شدت آ رہی تھی۔ اس مرتبہ زلزلہ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھنے والی جاپانی قوم کے افراد کا بھی صبر کا بندھن ٹوٹ چکا تھا۔ کچھ تو چیخ پکار کرتے ہوئے عمارت سے باہر بھاگے، جب کہ کئی لوگ میز کے نیچے بیٹھ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ تمام عمارتیں کاغذ بن چکی تھیں، جو ایک جانب سے دوسری جانب لہرا رہی تھیں۔''

ٹوکیو کی آبادی یوں تو ایک کروڑ ہے، مگر ان میں اردگرد سے تقریباً ۵۰ لاکھ افراد روزانہ کام کے لیے آتے ہیں، اس لیے صبح سے شام تک کے لیے آبادی ڈیڑھ کروڑ ہو جاتی ہے۔ ٹوکیو کا ریل سسٹم انتہائی جدید اور تیز رفتار ہے، اس لیے پچاس لاکھ لوگ مہنگائی کی وجہ سے ٹوکیو کے بجائے رہائش کے لیے اردگرد کے علاقے کو اہمیت دیتے ہیں۔ صبح ٹرین کے ذریعے سے ٹوکیو آتے ہیں اور شام کو واپس چلے جاتے ہیں۔ زلزلے والے دن بھی یہ پچاس لاکھ افراد ٹوکیو میں موجود تھے۔ تمام مواصلاتی نظام تباہ اور موبائل فون کے ٹاور گر گئے تھے۔ ٹیلے فون کی لائینیں ٹوٹ گئیں۔ ریل کی پٹریاں ٹیڑھی اور پُل کمزور ہو گئے۔ سڑکیں بیٹھ گئیں، جب کہ ائیر پورٹ کا نظام بھی تباہ ہو گیا۔ سمندر کے قریب کے علاقے ڈوب گئے اور عمارتیں تباہ ہو گئیں۔ یوں ٹوکیو کا شہر کا سارا نظام تہس نہس ہو گیا اور ۵۰ لاکھ باہر سے آنے والے جاپانی اُس شہر میں قید ہو کر رہ گئے۔ شہر میں اُن کے رہنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ ان کا اپنے گھر والوں سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ یہ سارے لوگ سڑکوں پر تھے اور ان کے لیے یہ لمحات کسی قیامت سے کم نہ تھے۔

اُن کی رہایش، کھانا پینا، سردی سے بچنے کے لیے لحاف اور کمبل وغیرہ کا انتظام اور دیگر فطری ضرورت کا مسئلہ موجود تھا۔ ایسے وقت میں ٹوکیو سمیت ہر جاپانی باشندے نے ایثار اور قربانی کا عملی مظاہرہ کیا۔ دکان داروں نے اپنی اشیا کی قیمتیں نہ صرف کم کر دیں بلکہ کئی دکان داروں نے سامان کے ساتھ چھوٹے باکس رکھ دیے، جن پر لکھا ہوا تھا: ''آپ کو جو چیز چاہیے، بغیر پوچھے لیجیے اور اس کے لیے جو رقم دے سکتے ہیں، اس باکس میں ڈال دیجیے۔''

لوگوں نے اپنی ضرورت کی اشیا لیں اور کم زیادہ رقم باکس میں ڈال دی۔ اس طرح عام شہریوں نے اپنی ضرورت سے زائد رضائیاں، گدے، کمبل اور جیکٹ وغیرہ اپنے گھروں کے باہر رکھ دیں، جو ان پچاس لاکھ متاثر افراد کے کام آئے۔ یہ تمام لوگ کھلے آسمان کے نیچے اپنی قوم کے لوگوں کے آسرے پر بیٹھے تھے۔ اس ایثار کا یہ نتیجہ نکلا کہ کسی قسم کا شور، بدنظمی یا حکومت کے خلاف جلوس نہیں نکلا۔ یہ تمام لوگ صبر اور خاموشی سے مواصلاتی نظام کے بحال ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ اسی دوران ڈاکٹروں نے متاثرین میں موجود بیماروں کا علاج شروع کر دیا۔ انجینئر حضرات ریلوے ٹریک ٹھیک کرنے میں لگ گئے۔ انھوں نے سڑکیں ٹھیک کرنا اور ٹیلے فون لائنوں کی درستی کے لیے بھی کوششیں تیز کر دیں۔ مزدوروں اور مستریوں نے بھی اپنی خدمات دینا شروع کر دیا۔ اس طرح صرف دو دن میں ٹوکیو کا نظام بحال ہونا شروع ہو گیا اور لوگ گھروں کو روانہ ہونے لگے۔ ان دنوں میں کسی بدنظمی کا معمولی سے مظاہرہ بھی نہ ہوا اور سڑک پر کوئی گندگی بھی دکھائی

نہیں دی۔ یہ بھی حیرت انگیز بات نظر آئی کہ اس آفت کے موقع پر ملک میں مہنگائی کے بجائے قیمتوں میں کمی ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ جاپانی قوم دنیا کی عجیب قوم ہے۔ یہ دنیا کے کسی بھی علاقے میں ہو، اس کے پاس چاہے کسی اور ملک کی شہریت ہو، یہ مصیبت کی گھڑی میں ہمیشہ جاپانی ہی رہتے ہیں۔ وہ ہر وقت اپنی جان اور دولت جاپان پر نثار کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ قدرتی آفات کے بعد ان ملکوں کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے، مگر جاپان میں ایسا نہیں ہوتا۔ ۱۹۹۵ء اور ۲۰۱۱ء کے زلزلوں نے جاپانیوں کو عظیم قوم ثابت کیا، کیوں کہ ان مواقع پر دنیا بھر میں موجود جاپانیوں نے اپنے اکاؤنٹس میں موجود رقم جاپان بھیجنا شروع کر دی۔ اس سے جاپان کی معیشت بکھرنے سے بچ گئی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جاپانیوں نے اپنی تعمیری عادتوں کی وجہ سے خود کو دنیا میں ایک مضبوط قوم ثابت کیا ہے۔ ان عادتوں میں ایک برداشت کی قوت ہے۔ وہ آفات کے مواقع پر شکوے اور شکایات نہیں کرتے۔ ان کا صبر بھی مثالی ہے کہ انھوں نے حکومت یا دیگر اداروں کی جانب سے دی جانے والی اشیا انتہائی صبر کے ساتھ لائن میں کھڑے ہو کر حاصل کیں۔ اس موقع پر کوئی لاٹھی چارج یا بدنظمی نہیں دیکھی گئی۔ جاپان میں چوں کہ زلزلے وغیرہ آتے رہتے ہیں، اس لیے انھوں نے ان سے بچاؤ کے مستقل بندوبست کو اپنی عادت بنا لیا ہے۔ جاپانی قوم کی خود اعتمادی بھی قابلِ رشک ہے۔ وہ ایسے مواقع پر بھی ضرورت کی اشیا چاہے مفت ہی کیوں نہ ملیں، نہیں لیتے، دوسروں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ ان میں قربانی کا جذبہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہاں قانون کی حکمرانی بھی ہے۔ اس آفت میں بھی کہیں لوٹ مار یا چوری کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔

جاپانیوں نے ایسے مواقع پر قومی ذمے داری کا بھی ثبوت دیا اور مصیبت میں

...ی قوم کے لیے اشیا کے نرخ کم کر دیے۔ اس کے علاوہ جاپان کے میڈیا نے بھی ...س شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے قوم کے لیے حوصلہ افزا باتیں ہی نشر کرنا شروع کیں۔ ان کی ایک عادت ایمان داری ہے۔ جب زلزلے اور سونامی کی وجہ سے ایٹمی بجلی گھر تباہ ...ئے اور ٹوکیو شہر کی بجلی بند ہو گئی تو اس وقت کئی لوگ مختلف اسٹور میں خریداری کر رہے ...ے۔ بجلی بند ہوتے ہی کمپیوٹر بھی رک گئے اور اس طرح رقم کا اندازہ بھی کرنا ممکن نہ رہا تو ...گوں نے ہاتھوں میں اُٹھائی ہوئی اشیا دوبارہ بکس میں رکھ دیں۔ نونہالو! آخر ہم پاکستانی ...ی ایسے ہی کیوں نہیں ہو سکتے۔ ☆

سنہری باتیں

- علم کو اللہ نے بھوک اور سفر میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے کھانے پینے اور وطن میں تلاش کرتے ہیں۔ بھلا وہ کیسے پائیں گے؟
- عزت کو اللہ نے اپنی اطاعت میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ حکمرانوں کے در پر تلاش کرتے ہیں۔ بھلا وہ کیسے پائیں گے؟
- بلندی کو اللہ نے عاجزی و انکسار میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے غرور و تکبر میں تلاش کرتے ہیں۔ بھلا وہ کیسے پائیں گے؟
- دعا کی قبولیت کو اللہ نے لقمۂ حلال میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے حرام ذرائع سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بھلا وہ کیسے پائیں گے؟
- دولت کو اللہ نے قناعت میں چھپا رکھا ہے، مگر لوگ اسے عیش و عشرت میں تلاش کرتے ہیں۔ بھلا وہ کیسے پائیں گے؟

مرسلہ: وامق عدنان راولپنڈی

پھول نگر

یاسمین حفیظ

ابا جی کا تبادلہ ایک پہاڑی علاقے میں ہوا تو خوشی سے ہم پھولے نہ سما رہے تھے۔ اونچے نیچے پہاڑی سلسلوں کے درمیان واقع وہ وادی پھول نگر کے نام سے جانی پہچانی جاتی تھی۔ پھول نگر واقعی پھول نگر تھا۔ جہاں ہر طرف ہریالی اور خوب صورتی تھی۔

میرا نام بلال ہے اور میں ابا جی کا لاڈلا بیٹا ہوں اور میرا جڑواں بھائی دانیال ہے۔

میں اور دانیال پڑھائی کے ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہتے ہیں۔ ہم دونوں باکسنگ اور کراٹے بھی جانتے تھے۔

پھول نگر آ کر ہمارا مقامی اسکول میں داخلہ ہو گیا تھا۔ پڑھائی اور گھر کے کاموں سے فارغ ہوتے تو کہانیاں پڑھتے تھے اور وادی میں گھومتے تھے۔

وہ ایک خوش گوار صبح تھی۔ رات سے ہلکی ہلکی بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں اور دانیال فجر کی نماز ادا کر کے سیر کو نکل گئے۔ ہماری پسندیدہ جگہ اونچی پہاڑی کی پگڈنڈیاں تھیں۔ پھول نگر کی ایک اونچی پہاڑی پر ایک بڑا مکان بنا ہوا تھا۔ وہاں کوئی نہیں رہتا تھا۔ وہ مکان سبز بیلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بڑے بڑے درختوں کی اوٹ میں واقع تھا۔ وہ مکان کسی حد تک ہمیں پُر اسرار بھی لگتا تھا۔ دانیال کا خیال تھا کہ یہ کسی ڈریکولا کا مسکن ہے، لیکن مجھے اس بات پر ذرا بھی یقین نہ تھا کہ یہ خوب صورت سا مکان، بھوت بنگلا یا آسیب زدہ ہو گا۔ اگر چہ یہ مکان بہت پُر اسرار سا تھا، مگر بالکل ویران نہ تھا، کیوں کہ میں نے ایک بار اپنی چھوٹی سی دوربین سے اس مکان کے آس پاس کچھ مشکوک افراد کو دیکھا

تھا اور ایک بار ایک بند گاڑی میں اس گھر سے کچھ لوگ جاتے ہوئے بھی دیکھے تھے۔ میں اس وقت سامنے والی پہاڑی سلسلے میں ایک درخت کے پیچھے کھڑا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے میں ان لوگوں کو واضح طور پر نہیں دیکھ سکا، لیکن اس مکان کے راز سے واقف ہونے کے لیے میرا دل بے چین ہو گیا تھا۔

اس لیے آج میں اور دانیال فجر کی نماز کے بعد اس مکان کی طرف چل پڑے۔ دانیال قدم قدم پر میرا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ اگر چہ میں جانتا تھا کہ وہ خوف زدہ ہے، لیکن اپنے ڈر کو قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ دادا جی کہتے ہیں کہ جو لوگ ڈر اور خوف پر قابو پا لیتے ہیں، وہ کام یابی کا زینہ ایک ایک کر کے چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اس وقت ہم دونوں خوف زدہ تو تھے، مگر اس حد تک نہیں کہ ہمارے ارادے ٹوٹ جائیں۔ پھول نگر میں ابھی زیادہ چہل پہل نہیں ہوئی تھی۔ کچھ لوگ ورزش کرنے کے لیے پگڈنڈیوں کی طرف جا رہے تھے، لیکن ہم پھول نگر سے ذرا ہٹ کر پہاڑی پر بنے اس مکان کی طرف بڑھ رہے تھے، جو آسیب زدہ مشہور تھا اور لوگ اس طرف آنے سے گھبراتے تھے۔

ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا اور گہرے بادلوں کی وجہ سے ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ رات کی بارش کی وجہ سے کچے راستے کیچڑ زدہ ہو گئے تھے اور اوپر کی جانب قدم بڑھانے میں دشواری ہو رہی تھی، لیکن ہمارے ارادے پختہ تھے۔ آج ہم ہر حال میں اس آسیب زدہ مکان کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ اس پُر اسرار گھر میں کیا راز تھا، اس سے واقف ہونا چاہتے تھے۔ ہم آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ دھیرے دھیرے سامنے مشرقی پہاڑوں سے سورج نے سر اُٹھایا اور اندھیروں کو دور کرنا شروع کر دیا تھا، مگر آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا، اس لیے روشنی ایک سفید دھند میں چھپی ہوئی تھی۔ میں اور دانیال پہاڑی کی چوٹی پر بنے مکان کے قریب پہنچے۔ مکان پرانا ضرور تھا، مگر خستہ حال نہ تھا۔ اس کے

در و دیوار پر ایک ویرانی کا احساس چھایا ہوا تھا۔ مکان کے ارد گرد جھاڑ جھنکاڑ اُگ آیا تھا۔
لان میں بڑی ہوئی گھاس گھر والوں کی عدم دل چسپی ظاہر کر رہی تھی۔ آسیب زدہ مکان
کے قریب پہنچ کر خوف کی لہر ہمارے وجود میں پھیل گئی۔ مکان کے چاروں طرف اس قدر
جھاڑیاں تھیں کہ مکان آسیب زدہ دکھائی دیتا تھا۔ پرانے درختوں کی شاخیں مکان کی
چھت تک پہنچ رہی تھیں۔ ہم دونوں بھائی دل ہی دل میں آیت الکرسی پڑھتے ہوئے آگے
بڑھتے جا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ہم دونوں مرکزی دروازے تک پہنچ گئے۔ لکڑی کا پرانا
دروازہ بے حد مضبوط تھا۔ ہم نے ہلکا سا دباؤ ڈالا تو دروازہ کھلتا ہی چلا گیا۔ ہم دونوں
چر چراتے ہوئے دروازے کی آواز سن کر خوف زدہ ہو کر جھاڑیوں میں دبک گئے۔

سخت نوک دار جھاڑیوں نے خراشیں ڈال کر ہمارا استقبال کیا۔ بازو اور چہرے
پر کئی خراشیں آئی تھیں، جن میں سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔ ہم دونوں تکلیف برداشت
کرتے رہے کہ اچانک کسی نے ہمیں بالوں سے پکڑ کر اُٹھا لیا۔ ہمارے منھ سے زور دار
چیخیں نکل گئیں۔ ہمارے پیچھے جو کوئی بھی تھا، وہ انتہائی طاقت ور تھا۔ وہ ہم دونوں کو بالوں
سے گھسیٹتا ہوا مکان کے اندر لے گیا۔

''کون ہو تم لوگ؟'' لانے والے شخص نے ہمیں فرش پر پٹختے ہوئے پوچھا۔

ہم نے پلٹ کر دیکھا، پیچھے ایک دیو قامت شخص کھڑا تھا۔ دھوتی اور کرتے میں
اس کا کسرتی جسم اور اُبھری توند نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی۔

''پہلوان! یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' اندرونی کمرے سے ایک شخص برآمد ہوا، وہ
کوٹ پتلون پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے سے بے رحمی اور سفاکی ظاہر ہو رہی تھی۔

''کون ہیں یہ بچے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''صاحب! یہ بچے نہیں جاسوس ہیں۔ ہماری جاسوسی کر رہے تھے۔'' پہلوان نے

ایک ٹھوکر مجھے ماری اور میں درد سے تڑپ کر رہ گیا۔

''جاسوسی''؟ صاحب نے حیرت سے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ شاید اس نے
چودہ پندرہ سال کے جاسوس بچے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ حیرت زدہ سا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ ان دونوں کو بھی دوسرے بچوں کے ساتھ تہ خانے میں لے جاؤ۔''
صاحب نے حکم دیا۔

دیگر بچوں کا سن کر ہم چونک اُٹھے۔ آسیب زدہ مکان کے بارے میں خفیہ
پردے اُٹھ رہے تھے۔ پہلوان نے جھک کر ہم دونوں کو اُٹھانے کی کوشش کی ہی تھی کہ
اچانک ہم دونوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ میں باکسنگ اور کراٹے کلب کا ممبر تھا اور دانیال بھی
لڑائی میں کم نہ تھا۔ ہم دونوں نے ان پر مکوں اور لاتوں کی بارش کر دی۔

وہ حیرت سے مار کھا گئے۔ وہ ہمیں بچے سمجھ رہے تھے، لیکن ہم آج کے دور کے
بچے تھے، جو اپنی حفاظت کے لیے بہت کچھ سیکھ رہے ہیں اور اپنی مدد آپ کے تحت ہر طرح
کے مشکلات پر قابو پانے کا ہنر جانتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ دانیال نے اچانک پہاڑی
راستے کی طرف چھلانگ لگا دی اور وہ دوڑتا ہوا ان ڈھلوان راستے پر پھسلتا چلا گیا اور بہت
نیچے جا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا، مگر دوسرے لمحے وہ لڑکھڑایا اور ایک پتھر سے ٹکرا کر وہیں گر پڑا۔
شاید سر پر چوٹ لگنے سے وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

''پہلوان! بچے کے پیچھے جاؤ۔ اچھا ہوا، وہ خود ہی گر پڑا ہے۔ جلدی کرو۔''

باس نے مجھ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پیچھے موڑ کر
[illegible] دیے اور پھر مجھے دھکیلتا ہوا تہ خانے میں لے آیا۔

تہ خانے میں کل سولہ بچے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام حسن تھا، جس کی حالت
[illegible] خراب تھی۔ میں ان بچوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ معصوم اور پھول سے بچے

خوف زدہ تھے۔ خوف زدہ تو میں بھی تھا، لیکن مجھے اُمید تھی کہ اللہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔ مجھے دانیال کی بھی فکر تھی، مگر مجھے اللہ تعالیٰ پر بھروسا تھا جو اندھیری رات کے دامن سے صبح طلوع کرتا ہے۔ میں نے دل کی گہرائی سے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی۔ یہ سچ ہے، جو لوگ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہیں، وہ انھیں کبھی مایوس نہیں کرتا۔

میری دعا قبول ہوئی اور تھوڑی ہی دیر میں مکان کو پولیس نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پھر پولیس تہ خانہ تلاش کرنے میں کام یاب ہوگئی۔ پولیس نے مجھے اور سولہ بچوں کو تہ خانے سے نکالا۔ دونوں مجرم اور ان کے تین دوسرے ساتھی گرفتار ہوگئے۔ دانیال کے ساتھ ابا جی اور دادا جان بھی تھے۔ انھوں نے مجھے گلے لگایا۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے، کیوں کہ نہ صرف ہم دونوں سلامت تھے بلکہ بردہ فروشوں کے ایک بڑے گروہ کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا۔ دانیال نے بتایا کہ اسے بھاگتے ہوئے خیال آیا کہ اس کے اس طرح بھاگنے سے مجرم چوکنے ہو کر فرار ہو سکتے ہیں، اس لیے اُس نے بے ہوش ہونے کا ڈراما کیا اور پھر جیسے ہی پہلوان اس کے قریب آیا، اس نے پہلوان کو پتھر مار کر بے ہوش کر دیا اور گھر پہنچ کر ابا جی کو جلدی جلدی ساری بات بتائی۔ ابا جی نے فوری طور پر پولیس کو بلوایا اور مجرموں کو بے خبری میں گھیر لیا۔

میں دانیال کی عقل مندی پر بہت خوش ہوا۔ سب لوگ ہماری تعریف کر رہے تھے۔ مجرم ہتھکڑیوں میں جکڑے جا چکے تھے۔ سب لوگ کہہ رہے تھے کہ بچوں کو اس طرح بہادر اور عقل مند ہونا چاہیے۔

قوم کے نونہال جاگو اور جگاؤ کے پیغام کو پھیلا رہے ہیں۔ اب دشمن ہمارے ملک کی طرف غلط نگاہ نہیں ڈال سکتا۔ میں دادا جان کے سینے سے لگا سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

آشیانہ

جاوید بسام

مرزا صاحب کمرے میں سے آوازیں لگا رہے تھے: ''شرفو! ارے شرفو! کہاں مر گیا؟ جواب کیوں نہیں دیتا؟''

گھر کے کسی کونے سے آواز آئی: ''آیا جی، ابھی آیا، ذرا یہ کام نمٹا لوں۔''

''کتنی بار کہا ہے کہ پہلے میری بات سن لیا کر۔'' مرزا صاحب چلائے۔

تھوڑی دیر بعد شرفو کپڑے سے ہاتھ پونچھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا: ''جی، کیا کام ہے؟''

مرزا صاحب غصے سے بولے: ''اتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں، کہاں تھا؟''

''کپڑے دھو رہا تھا جی۔''

''کل کیاریوں میں اسپرے کیوں نہیں کیا تھا؟ ساری رات مجھے مچھر کاٹتے رہے۔''

''شام کو آپ کے سامنے ہی تو کیا تھا، ابھی تک خوش بو آ رہی ہے۔'' شرفو ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔

''اچھا پھر کیوں مچھر آ رہے ہیں؟'' وہ نرم پڑتے ہوئے بولے، انھیں یاد آ گیا تھا کہ واقعی شرفو نے اسپرے کیا تھا۔

''حضور! موسم بدل رہا ہے۔ خشک ہوا چل رہی ہے۔ شاید آپ کو خشکی ہو رہی ہے۔''

''ہاں سردی آ رہی ہے، لیکن یہاں تو دھوپ ہی نہیں آتی۔ درخت نے ساری دھوپ روک رکھی ہے اور لگتا ہے اس درخت کی وجہ سے مچھر بھی پیدا ہو رہے ہیں۔'' مرزا صاحب کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولے۔

''ہو سکتا ہے جی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' شرفو نے جان چھڑائی اور باہر نکل گیا۔ اسے ابھی بہت سارے کام کرنے تھے۔

مرزا صاحب ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے۔ سارا دن گھر پر ہوتے، اخبار پڑھنا، ٹی وی دیکھنا اور شرفو پر حکم چلانا، بس یہی کام رہ گئے تھے۔

دوسرے دن وہ پھر شرفو کو آوازیں دے رہے تھے۔ وہ جھاڑو ہاتھ میں لیے اندر آیا تو بولے: ''کل میں نے ایک مچھر اپنی آنکھوں سے اُڑتے دیکھا ہے۔ لگتا ہے اسپرے کام نہیں کر رہا۔ موسم بھی بدل رہا ہے۔ ایسا کرتے ہیں، درخت کٹوا دیتے ہیں۔'' وہ باہر نظر دوڑاتے ہوئے بولے، جہاں درخت کے پتے ہوا سے جھوم رہے تھے۔

''جیسا آپ کہیں۔'' شرفو بولا۔

''جا، کسی مالی کو لے آ۔''

''دوپہر کو جاؤں گا۔ ابھی تو بہت سارے کام پڑے ہیں۔'' شرفو نے جواب دیا۔

دن ڈھل رہا تھا کہ ایک مزدور آ گیا۔ مرزا صاحب باہر چلے آئے۔ ''میاں اس درخت کو کٹوانا ہے، چالیس سال پہلے جب ہم نے یہ گھر بنوایا تھا جب سے ہی لگا ہے۔'' وہ اوپر دیکھتے ہوئے بولے، جہاں گھنے پیپل کے درخت کے پتے ہوا سے سرسرا رہے تھے اور ہلکی دھوپ چھن چھن کر نیچے آ رہی تھی۔

مزدور بولا: ''کاٹ دیں گے جی، لیکن یہ بہت بڑا ہے۔ اور آدمی بھی لگانے پڑے گے۔''

مرزا صاحب نے پوچھا: ''پیسے کتنے لوگے؟''

مزدور نے درخت کے وسیع تنے پر ہاتھ مارا اور بولا: ''دو ہزار دے دیجیے گا۔''

''کیا کہا...... دو ہزار درخت کاٹنے کے اتنے پیسے؟'' مرزا صاحب حیرت سے بولے۔

''حضور! مہنگائی تو دیکھیں اور ایک آدمی کا کام تو نہیں ہے۔''

مرزا صاحب بولے: ''نہیں بھئی، ہم تمھیں بس پانچ سو روپے دیں گے۔''

مزدور نے منھ بنایا اور کہا: ''دو ہزار مناسب ہیں۔ اس سے کم میں کوئی نہیں
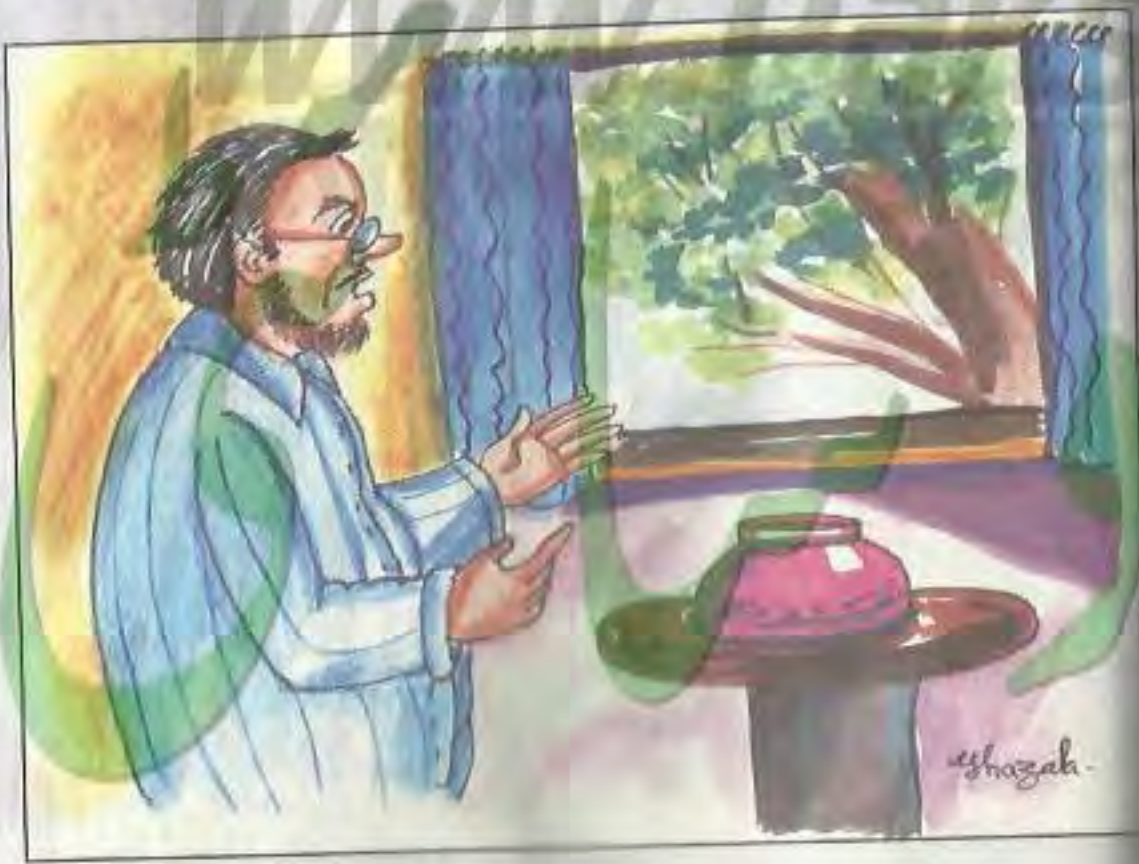
کاٹے گا۔''

دیر تک بحث ہوتی رہی، نہ مرزا صاحب آگے بڑھے، نہ مزدور نیچے آیا۔ آخر وہ بڑبڑاتا ہوا رخصت ہو گیا۔

مرزا صاحب، شرفو پر غصے ہوتے ہوئے بولے: ''عجیب بے ہودہ آدمی کو لیے چلے آئے، کل کسی اور کو ڈھونڈ کر لانا۔''

اگلے دن مرزا صاحب کھڑکی میں کھڑے تھے کہ انھوں نے بہت سے پرندوں کو دیوار پر بیٹھے دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ خاموش تھے۔ وہ حسب عادت شرفو کو آوازیں دینے لگے: ''یہ پرندے یہاں کیوں جمع ہیں؟ کیا دانہ نہیں ڈالا؟ ایسا لگتا ہے، بھوکے بیٹھے ہیں۔''

''دانہ تو جی میں روز ڈالتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے، انھوں نے کھانا چھوڑ دیا ہے۔''

''وہ کیوں؟ اور یہ کون کون سے پرندے یہاں نظر آ رہے ہیں، چڑیاں تو ہوتی

تھیں، میناؤں کے کئی جوڑے بھی دکھائی دے رہے ہیں اور وہ دیکھو! شاید کھٹ بڑھئی ہے۔'' وہ اشتیاق سے بولے۔

شرفو بولا: ''ہاں جی، وہی ہے۔ یہ سب درخت پر ہی رہتے ہیں۔ آپ کو فرصت ملے تو دیکھیں۔''

مرزا صاحب کو پھر درخت کٹوانے کا خیال آ گیا: ''تو مالی کو دیکھنے گیا؟''

شرفو نے کہا: ''ایک مزدور سے بات ہوگئی ہے۔ وہ ہزار روپے میں مان گیا ہے، لیکن ابھی اس کے پاس کام ہے، دو ایک روز میں آئے گا۔''

اگلے دن مرزا صاحب سارا دن ٹی وی دیکھتے رہے۔ تمام خبریں سیلاب زدگان کے بارے میں تھیں۔ ملک کے بہت سے علاقوں میں سیلاب نے تباہی مچادی تھی، بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے تھے اور بہت سے اپنے تباہ حال گھر چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں منتقل ہو رہے تھے۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ کھڑکی میں آ کھڑے ہوئے۔ باہر دیوار پر پرندے اسی طرح خاموش بیٹھے تھے۔ دیر تک وہ انھیں دیکھتے رہے۔ مینا کے بچے چوں چوں کر رہے تھے۔ وہ انھیں دانہ لا کر کھلا رہی تھی۔ وہ بمشکل اُڑ پاتے تھے۔ پھر درخت پر کویل کوکنے لگی۔ انھوں نے اس کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، لیکن وہ کہیں پتوں میں چھپی ہوئی تھی۔ وہ رہ رہ کر کوکتی رہی۔ انھوں نے کویل کی آواز میں درد محسوس کیا۔ پھر شرفو کمرے میں چلا آیا۔

''ادھر آ شرفو! دیکھ، ہمارے ہاں کون کون سے پرندے آ رہے ہیں۔ وہ دیکھ، چھوٹی کالی چڑیا بہت اچھا گاتی ہے، لیکن نا معلوم کیوں صبح سے خاموش بیٹھی ہے؟ اپنے لڑکپن میں ہم اسے پکڑنے کی کوشش کرتے تھے اور ہمارا تو خیال تھا کہ شہر میں اتنی آلودگی سے ان کا خاتمہ ہو گیا ہوگا، لیکن یہ اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں۔''

شرفو بولا: ''ہاں جی، اللہ کی قدرت ہے۔''

مرزا صاحب بولے: ''بے شک...... اللہ ہی مخلوق کا سب سے بڑا محافظ ہے۔''

اگلے دن صبح ہی صبح شرفو مزدور کو لے آیا: ''حضور! مالی آ گیا ہے، اس سے بات کر لیں۔''

مرزا صاحب بولے: ''اسے منع کر دو۔ ہم نے درخت کٹوانے کا ارادہ بدل دیا ہے۔''

شرفو سر کھجاتے ہوئے بولا: ''لیکن حضور! اب مزدور آ گیا ہے تو کٹوا لیتے ہیں، پھر مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔''

''اب مجھے درخت نہیں کٹوانا، اسے واپس بھیج دو۔'' وہ دو ٹوک لہجے میں کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولے، جہاں درخت پر نئی کونپلیں نکل رہی تھیں۔ انھیں محسوس ہوا، جیسے درخت کے سارے پرندے مرزا صاحب کے فیصلے سے خوش ہو رہے ہوں۔ ان کا آشیانہ جو محفوظ تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

ممتاز قلمی شخصیت

محمد عمران اسحاق

بزرگوں کی زندگی کا مطالعہ بچوں کی زندگی میں ہوا کرتا ہے۔ اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بڑا آدمی کیسے بنا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب پاکستان کے قابلِ فخر محقق، دانشور اور ماہرِ تعلیم تھے۔ آپ ۱۶- دسمبر ۱۹۱۷ء کو سندھ کے شہر سانگھڑ کے ایک گاؤں جعفر خان لغاری میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم نوشہرو فیروز ہائی اسکول سے حاصل کرنے کے بعد اعلا تعلیم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ اس کے بعد امریکا کی کولمبیا یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کیا۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کو سندھی، فارسی، عربی، اردو، سرائیکی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ آپ نے ان زبانوں میں سو سے زائد کتب تصنیف کیں۔ ایک اور علمی و ادبی کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے سندھ کے صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی تصنیف ''شاہ جو رسالو'' کو دس جلدوں میں ترتیب دیا۔

آپ اپنے بچپن میں اپنے استادوں اور والدین کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ جیسا چاہتے تھے، ویسا ہی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ کی بلند پایہ علمی تحقیقی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں آپ کو حکومتِ پاکستان نے پرائڈ آف پرفارمنس، ستارۂ قائدِ اعظم، ہلالِ امتیاز اور ایکسی لینس ایوارڈ سمیت درجنوں اعزازات عطا کیے۔ آپ کے نام سے سندھ یونی ورسٹی کے اولڈ کیمپس میں ڈاکٹر این۔ اے۔ بلوچ ماڈل ہائی اسکول بھی قائم ہے۔ آپ ایک محبِ وطن پاکستانی ہونے کے ساتھ بہت اچھے انسان بھی تھے۔ جو آپ سے ملتا، آپ کا گرویدہ ہو جاتا۔ سادگی، حلم و مروت اور ہر کسی کی علمی و ادبی ضرورت پورا کرنا آپ کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے دوست پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ۶- اپریل ۲۰۱۱ء کو حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال فرما گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال سے علم و تحقیق کے میدان میں جو خلاء پیدا ہوا ہے، وہ مشکل ہی سے پُر ہوگا۔ ☆

نئی چیز، نیا ذائقہ

پروفیسر محمد ظریف خاں

میرے بڑے بھائی پانچ چھے برس پہلے اعلا سرکاری ملازمت سے فارغ ہوئے تھے اور اب مطالعۂ کتب اور مختلف اخبارات و رسائل کے لیے مضمون نگاری اُن کا مشغلہ ہے۔ اُن کا ذاتی کتب خانہ بھی ہے۔ میں اکثر و بیشتر ان کے گھر پر جاتا رہتا ہوں۔ اُن کے مکان کی جھاڑ پونچھ کے لیے روزانہ ایک عورت آیا کرتی ہے۔ یہ خاتون عام گھریلو نوکرانیوں سے خاصی مختلف ہے۔ وہ خود صاف ستھری رہتی ہے، جب کہ اس کے ساتھ آنے والا تقریباً تین برس کی عمر کا اُس کا بیٹا بھی اُجلے کپڑے پہنے ہوئے ہوتا ہے۔ ایک شام میں اور بھائی جان کتب خانے میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے میں مصروف تھے کہ وہی

عورت گھر کی صفائی کرنے کے لیے آ گئی۔ اُس کے ساتھ اُس کا بچہ بھی تھا، جو ایک کونے میں جا بیٹھا۔ اُس کے ہاتھ میں باجرے کی میٹھی ٹکیا تھی، جسے وہ بڑی رغبت کے ساتھ کھانے لگا۔ اُسی لمحے بھائی جان کا پوتا سرمد بھی کھیلتا ہوا اسی کمرے میں چلا آیا۔ اُس نے جب عورت کے بیٹے جعفر کو ٹکیا کے ٹکڑے چباتے ہوئے دیکھا تو کچھ دیر تک اسے گھورتا رہا اور پھر اس سے ''وہ شے'' مانگ بیٹھا، مگر جعفر بھلا اسے کیوں دیتا؟ اُس نے اپنا ہاتھ اپنی پشت کی جانب موڑ دیا۔ اُسے ایسا کرتے دیکھ کر سرمد میاں رونے لگے۔ جہاں وہ عورت سرمد کی

طرف متوجہ ہوئی، وہیں بھائی جان بھی جو بڑی دل چسپی کے ساتھ دو ننھے فرشتوں کے درمیان ہونے والا یہ جھگڑا دیکھ رہے تھے یک دم ہنس دیے۔ انھوں نے جعفر کو بڑے پیار کے ساتھ اپنے پاس بلایا اور اسے بسکٹ کا ایک پیکٹ دیتے ہوئے بولے: ''جعفر میاں! یہ تم رکھ لو اور بھائی کو اس ٹکیا کا ایک ٹکڑا دے دو۔''

جعفر نے خوشی خوشی وہ پیکٹ وصول کر کے ایک ٹکڑا تو کیا پوری کی پوری ٹکیا ہی رمد کے حوالے کر دی۔ پھر دونوں بچے ایک ساتھ نئی چیز کا نیا ذائقہ لینے لگے۔ یہ صورت حال دیکھ کر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا، جو مجھے میرے والد مرحوم نے سنایا تھا۔ یہ بالکل سچا واقعہ ہے۔

بھارت کے ایک قصبے دیو بند میں دینی تعلیم کا عظیم ادارہ ''دارالعلوم دیو بند'' زشتہ ایک سو چالیس برس سے قائم ہے۔ ایک زمانے میں میاں فیاض حسین نام کے ایک بزرگ اس ادارے کے نگراں تھے۔ بڑے نیک، پارسا اور خوش مزاج۔ انھی دنوں بمبئی سے تعلق رکھنے والے ایک دین دار دولت مند تاجر نے دارالعلوم کی مالی مدد کرنے کے لیے وہاں کا دورہ کیا۔ مدرسے کے باورچیوں نے میاں صاحب سے پوچھا کہ سیٹھ صاحب کے لیے دوپہر کے کھانے میں کیا اہتمام کیا جائے تو میاں صاحب نے جواب دیا: ''اصلی گھی سے بگھاری ہوئی ارہر کی دال پکاؤ اور گرم گرم روٹیوں کے ساتھ اُنھیں پیش کرو، مگر اس سے پہلے اُن کے کسی خادم سے یہ بات معلوم کر لو کہ سیٹھ صاحب عموماً دوپہر کا کھانا کس وقت کھاتے ہیں؟''

باورچیوں کو میاں صاحب کے اس حکم پر بہت حیرت ہوئی، بولے: ''وہ بڑے آدمی ہیں، اُن کے لیے تو مرغ مسلّم ہونا چاہیے۔''

میاں صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا: ''ارے بھئی! ایسا ہی کرو، جیسا میں کہہ رہا ہوں، پھر تماشا دیکھو۔''

کچھ دیر بعد ایک باورچی نے میاں صاحب کو آ کر بتایا کہ سیٹھ صاحب کے خادم خاص نے بتایا ہے کہ وہ نماز ظہر سے فارغ ہو کر فوراً کھانا کھا لیتے ہیں۔ اس پر میاں صاحب نے باورچی کو ہدایت کی کہ سیٹھ صاحب کے سامنے دال کے پیالے نماز ظہر کے کوئی ایک گھنٹہ تاخیر سے رکھے جائیں۔ دوسری بات یہ کہ اُن کے لیے کھانے کا اہتمام

باورچی خانے سے قریب کہیں کیا جائے، ایسی جگہ جہاں بیٹھ کر وہ بگھار کی خوش بو سونگھ سکیں۔ اُس کے فوراً بعد دال اور گرما گرم چپاتیاں لائی جائیں اور چپاتیاں لانے میں وقفہ نہ ہو۔''

باورچیوں نے میاں صاحب کی ہدایات پر لفظ بہ لفظ عمل کیا۔ انھوں نے سیٹھ صاحب کے لیے ایک ایسے کمرے کا انتخاب کیا جو باورچی خانے سے بالکل ملا ہوا تھا۔ سیٹھ صاحب جب نمازِ ظہر ادا کر کے تشریف لائے تو انھیں اسی کمرے میں جس کے فرش پر دری اور چاندنی بچھی ہوئی تھی، بٹھایا گیا۔ پھر میاں صاحب اور ادارے کے چند ذمے دار بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اب سیٹھ صاحب کو بھوک ستا رہی تھی، مگر وہاں کھانے کا نام بھی نہ تھا۔ اچانک باورچی خانے سے دال بگھارنے کی بھینی بھینی مہک اُس طرف آئی تو سیٹھ صاحب کی بھوک مزید چمک اُٹھی اور پھر کوئی پانچ منٹ بعد دو باورچی وہاں داخل ہوئے، جن کے ہاتھوں میں دال کی قابیں تھیں۔ اُن کے ساتھ دو باورچی اور تھے، جن میں سے ایک نے تیزی کے ساتھ دسترخوان بچھایا اور دوسرے نے اُس پر رکابیاں اور چمچے سلیقے کے ساتھ چن دیے۔ ایک اور باورچی روٹیاں لے آیا۔ کمرا گرما گرم روٹیوں کی خوش بو سے مہک گیا۔ روٹیوں کا دسترخوان پر رکھا جانا تھا کہ سیٹھ صاحب بسم اللہ پڑھ کر ''دال'' پر ٹوٹ پڑے۔ تازہ تازہ چپاتیاں آتی رہیں اور سیٹھ صاحب اور ان کے ساتھی کھاتے گئے۔ یہاں تک کہ جب کھانے والوں کے پیٹ خوب بھر گئے تو انھوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچا۔ بعد میں سیٹھ صاحب دیر تک دال روٹی کی تعریف کرتے رہے۔ اُن کے بہ قول انھوں نے بہت عرصے بعد اتنا لذیذ کھانا کھایا تھا۔

جب سیٹھ رخصت ہو گئے تو جامعہ کے ذمے داروں نے تعجب کے ساتھ میاں صاحب سے پوچھا کہ آخر لذیذ اور قیمتی کھانے والے ان دولت مند سیٹھ صاحب کو یہ سادہ غذا کس لیے پسند آئی؟ تو میاں صاحب نے مسکرا کر کہا: ''بھئی سیدھی سی بات ہے۔ تین

نہیں۔ ایک تو یہ کہ ارہر کی دال سیٹھ صاحب کے لیے نئی چیز اور ذائقہ انوکھا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ دال بڑے سلیقے سے پکائی گئی اور اچھے طریقے سے پیش کی گئی اور...... تیسری بات یہ ہے کہ جب سیٹھ صاحب کی بھوک خوب چمک گئی تو کھانا اُن کے سامنے لایا گیا۔'' یہ کہہ کر میاں صاحب سانس لینے کے لیے رکے اور پھر ہنس کر فرمایا: ''بھائیو! نئی چیز یا ذائقہ سب کو پسند آتا ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ اُس میں لذت ہو۔''

بھائی جان کے پوتے سرمد کو باجرے کی ٹکیا پسند آنا بھی ایسی ہی بات تھی۔ ☆

ہمدرد نونہال کی قیمت

آج کل منہگائی نے ہر ایک کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہر چیز کی قیمت بڑھ گئی ہے اور روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا چاہیے کہ منہگائی ختم ہو اور عوام کی پریشانی دور ہو۔ ہمدرد نونہال کی قیمت فروری ۲۰۰۹ء سے ۲۵ روپے ہے۔ ۲ سال ۴ مہینے ہو گئے۔ اس عرصے میں ہر چیز کی قیمت بڑھ گئی۔ کاغذ تو بہت ہی منہگا ہو گیا، اس لیے ہم بھی مجبور ہو رہے ہیں اور مجبوراً یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جولائی ۲۰۱۱ء سے ہمدرد نونہال عام شمارے کی قیمت

۳۰ روپے

کر دی جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمدرد نونہال پڑھنے والے سب دوست اس کو خوشی سے قبول کریں گے۔

ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان

ہنڈ کلیا

تھائی ٹوسٹ

مرسلہ: سدرہ نور الدین شیخ، پرانا سکھر

مرغی کا گوشت : ایک پاؤ
آلو : دو عدد
انڈے : تین عدد
ڈبل روٹی (درمیانی) : ایک پیکٹ
نمک : حسب ذائقہ
کالی مرچ (پسی ہوئی) : حسب ضرورت
تیل : تلنے کے لیے

ترکیب: مرغی کے گوشت کو اُبال کر اس کے ریشے الگ الگ کر لیں۔ پھر آلوؤں کو اُبال کر بُھرتا بنا لیں۔ اب اس میں مرغی کے ریشے ملا لیں اور ساتھ ہی نمک اور کالی مرچ ملا لیں۔ جب سب چیزیں اچھی طرح مل جائیں تو آمیزے کو سلائس کے ایک طرف اس طرح لگائیں، جیسے مکھن لگاتے ہیں۔ پھر ایک برتن میں تین انڈے پھینٹ لیں۔ سلائس کے جس طرف آمیزہ لگایا ہے پہلے اسے سینکیں اس کے بعد آمیزہ لگے سلائس کو انڈوں میں ڈبو کر درمیانی آنچ پر تیل میں تل لیں۔ مزے دار تھائی توسٹ تیار ہیں۔ کیچپ یا چٹنی کے ساتھ نوش کریں۔ ☆

گول گپے

مرسلہ: سیدہ رشیدہ جہاں، کراچی

میدہ : آدھا کلو
کھانے کا سوڈا : ایک چٹکی
سفید چنے : ایک پاؤ
املی : آدھا پاؤ
نمک : حسب ذائقہ
سرخ مرچ : حسب ذائقہ
تلنے کے لیے تیل : آدھا کلو

ترکیب: آٹے میں کھانے کا سوڈا اور پانی ڈال کر ملائم گوندھ لیں۔ چنے رات کو بھگو کر رکھ دیں، صبح اُبال لیں۔ ایک اُبال آنے کے بعد کھانے کا سوڈا معمولی سا ڈال لیں اور آنچ دھیمی کر دیں۔ جب چنے گل جائیں تو چولھا بند کر دیں۔ آٹے کی پتلی چھوٹی روٹی بیل لیں۔ فرائی پین میں تیل گرم کریں اور اس میں ایک روٹی ڈال کر دیکھیں کہ پھول رہی ہے یا نہیں۔ اگر نہ پھولے تو معمولی سا کھانے کا سوڈا مزید ڈال دیں۔ روٹی کو سرخ نہ کریں بلکہ جیسے ہی روٹی پھول جائے، اسے فوراً نکال لیں۔ ایک پیالے میں املی کا پانی ڈال لیں۔ یہ بہت پتلا ہونا چاہیے جیسے بازار میں گول گپوں کے ساتھ ملتا ہے۔ اس میں نمک اور پسی ہوئی سرخ مرچ ڈال کر ملائیں۔ اب گول گپے میں چھوٹا سا سوراخ کر لیں اور اس میں چنے ڈال لیں اور املی کا پانی ڈال کر مزے دار گول گپے کھائیں۔ ☆

آج کل

ضیاء الحسن ضیا

وعدہ کر کے بھول جانا آج کل تو عام ہے
پل میں گھڑ لینا بہانہ آج کل تو عام ہے

کام سے دامن چھڑانا آج کل تو عام ہے
بیٹھ کر باتیں بنانا آج کل تو عام ہے

سارے ٹی وی کے ڈرامے دیکھنا، پھر اس کے بعد
دیر سے دعوت میں آنا آج کل تو عام ہے

اُلٹی سیدھی بات کر کے دوستوں کے درمیاں
سب کو آپس میں لڑانا آج کل تو عام ہے

پانی کے پائپ میں گردش کرتی رہتی ہے ہوا
نل میں پانی کا نہ آنا آج کل تو عام ہے

مَن گھڑت باتوں کو پھیلانا ذرا سی دیر میں
خوب بے پَر کی اُڑانا آج کل تو عام ہے

پہلے تو ناراض کرنا دوسروں کو اے ضیاؔ!
خود ہی جا کر پھر منانا آج کل تو عام ہے

کمپیوٹریا

نوشاد عادل

واحد بھائی کمپیوٹر گھر میں کیا لے آئے، جیسے زمانے بھر کی خوشیاں سمیٹ لائے ہوں۔ پتا نہیں کس نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ کمپیوٹر خرید لیں، اب کمپیوٹر کا زمانہ ہے، لہٰذا یہ چیز ضروری ہے۔ بس پھر کیا تھا چند روز بعد ہی واحد بھائی نے کمپیوٹر خرید لیا۔ اب نہ گھر والوں کو کھانے کا ہوش اور نہ پینے کا، بس کمپیوٹر سے ہی چمٹے رہتے تھے۔ حد تو یہ تھی کہ واحد بھائی اور ان کے نالائق بچوں کے ساتھ ساتھ ان کی بیگم صاحبہ کو بھی کمپیوٹر میں گہری دل چسپی ہو گئی تھی۔

''ارے یہ موا چلتا کیسے ہے؟ مجھے چلا کر دکھاؤ تو ذرا۔'' بیگم صاحبہ نے واحد بھائی کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''یہ کوئی رکشا نہیں ہے بیگم!'' واحد بھائی نے انھیں سمجھایا: ''اسے بڑے طریقے سے چلانا پڑتا ہے۔''

''ابا! یہ بٹن دباؤ۔'' ایک بچے نے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر لگے کئی بٹن دبا دیے۔

''ایسے بٹن نہیں دباتے۔ کمپیوٹر خراب ہو جائے گا۔'' دوسرے بچے نے پہلے کے منھ پر تھپڑ مارا تو اس نے جوابی حملہ کر دیا اور دونوں فرش پر گتھم گتھا ہو گئے۔ حیرت کی بات یہ تھی واحد بھائی اور بیگم صاحبہ نے لڑتے ہوئے بچوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ان کی توجہ کمپیوٹر پر لگی ہوئی تھی۔ اس دوران گلی کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

بیگم صاحبہ بولیں: ''جا کر دیکھو کون آیا ہے۔''

واحد بھائی تنک کر بولے: ''دروازہ میں کھولوں۔ یہ بچے کس لیے ہیں آخر؟ صرف کھانے کے لیے؟''

''اب دماغ مت کھاؤ۔ جا کر دیکھو کون بے صبرا دروازہ توڑ رہا ہے کم بخت۔''

واحد بھائی بڑبڑاتے ہوئے اُٹھے اور دروازے پر پہنچ کر چلائے: ''کون ہے بھئی؟ کیا بے چینی ہے۔ ...... سن لیا ہے، بہرے نہیں رہتے یہاں۔'' اور انھوں نے دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی کوئی لپک کر واحد بھائی کے گلے لگ گیا: ''مبارک ہو بھائی صاحب! مبارک ہو بہت بہت، آپ نے تو دل میرا جیت لیا۔''

وہ واحد بھائی کا سب سے چھوٹا سالا اور اچھا خاصا کالا تھا۔ ایک نمبر کا کاہل اور نکھٹو۔ سارا سارا دن گھر میں چارپائی توڑتا رہتا تھا۔ کھاتا تھا اور ٹی وی دیکھتا تھا۔ اس کی ساری زندگی ٹی وی کے گرد گھومتی تھی۔ گھر والے اس سے عاجز تھے۔ کبھی کبھی وہ مہینے بھر کے لیے بیمار بن جاتا تھا۔ گھر والوں کے دوا پر الگ پیسے خرچ ہوتے تھے۔ پرہیزی کھانے کھا کے اخراجات بڑھ جاتے تھے۔ شروع میں تھوڑا بہت پڑھ لکھ کر اپنے ہی اوپر لاد لیا تھا۔ اپنے وزن سے زیادہ کھاتا تھا۔ واحد بھائی نے اس کی شکل بعد میں دیکھی تھی، پہلے اس کے جسم سے آنے والی بو سے اسے پہچانا تھا۔

''میں نے دل کیسے جیت لیا؟ کیا ریس میں حصہ لیا تھا؟'' واحد بھائی نے مشکل سے اسے الگ کیا۔ سالا زبردست تالی مار کر بولا: ''ارے آپ نے کمپیوٹر خرید کر کمال کر دیا ہے۔ میری دلی آرزو پوری کر دی ہے۔ آپ کتنے اچھے ہیں۔''

''اور تم کتنے گندے ہو، نہاتے بھی نہیں۔'' واحد بھائی روانی میں بول گئے۔ سالا بے عقل بھی تھا۔ ان کی بات پر ہنس کر ان کے گال پر ہلکی سی چپت لگائی: ''شریر۔'' یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب دوڑ گیا۔ واحد بھائی دروازہ بند کر کے سر کھجاتے ہوئے اندر چل پڑے۔

چار دن ہو گئے۔ واحد بھائی کا سالا تمیز الدین عرف گڈو کمپیوٹر کے سامنے سے نہیں ہٹا تھا۔ اس نے چار دن اور راتیں کمپیوٹر چلا کر عالمی ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔ تب سے خود

بھی جاگ رہا تھا اور کمپیوٹر کو بھی جگایا ہوا تھا۔ واحد بھائی ہر دو گھنٹے بعد بجلی کا میٹر دیکھ کر آتے اور اسے تیزی سے گھومتا دیکھ کر ان کا دماغ بھی گھوم جاتا تھا۔ انھوں نے ایک بار دبے دبے لفظوں میں بیگم سے کہا تھا: ''بیگم! گڈو سے کہو کہ خود بھی تھوڑا آرام کر لے اور کمپیوٹر کو بھی سانس لینے دے۔ یہ تو بھوت بن کر چمٹ گیا ہے۔''

بیگم صاحبہ نے آنکھیں نکالیں: ''خبردار! میرے لاڈلے بھائی کے لیے اور کچھ نہ کہنا۔ سب سے چھوٹا بھائی ہے میرا۔ سب کا چہیتا، بڑے نازنخروں سے پالا ہے۔ اسے کھیلنے دو۔''

''سب سے چھوٹا ہے اور سب سے موٹا بھی ہے۔ اتنا بڑا اونٹ کا اونٹ ہو گیا ہے، مگر حرکتیں وہی بچوں والی ہیں، اسے سمجھاؤ کہ تھوڑا اچل پھر بھی لے۔ چار دن سے کرسی پر بیٹھا ہے۔ کرسی بھی تھک گئی ہوگی۔'' واحد بھائی بولتے چلے گئے۔

''ارے! ذرا کمپیوٹر پہ کیا بیٹھ گیا میرا بھائی کہ تمھارا دم نکلنے لگا ہے۔ کچھ دن بعد جب دل بھر جائے گا تو چلا جائے گا وہ۔''

''نہ اس کا دل بھرے گا نہ پیٹ۔'' واحد بھائی پیر پٹختے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ رات دو بجے تک واحد بھائی کمپیوٹر کے قریب اس خیال سے بیٹھے رہے کہ شاید گڈو انھیں رحم کھا کر کمپیوٹر پر بیٹھنے کا موقع دے، لیکن مجال ہے جو گڈو نے مانیٹر کے اسکرین کے علاوہ کسی اور شے کو بھی دیکھا ہو۔ واحد بھائی نے ایک کوشش کی: ''گڈو! سب نے کھانا کھالیا ہے، تم رہ گئے ہو، جا کر کھانا کھالو۔''

گڈو اس وقت گیم کھیلنے میں مصروف تھے، نظریں ہٹائے بغیر کہا: ''میرا کھانا یہیں لا دیں بھائی صاحب!''

واحد بھائی کے دل میں آیا کہ گڈو کا منھ مانیٹر میں گھسا دیں۔ پھر وہ اُٹھے اور بیگم صاحبہ کے کمرے میں جا کر کہا: ''گڈو سے کہو کھانا کھالے، وہ تو اُٹھ ہی نہیں رہا۔ ایسی معلوم ہوتا ہے جیسے کرسی پر گوند لگا کر بیٹھ گیا ہے۔''

بیگم صاحبہ چمک کر کہنے لگیں: ''ہائے میرے شہزادے سے بھائی کی خوشیاں دیکھی ...جا رہی ہیں۔ جب سے وہ آیا ہے، میں دیکھ رہی ہوں تم بے چین ریچھ کی طرح ...سے اُدھر چکر کاٹے جا رہے ہو۔ اگر کھانا اسے خود لے جا کر دے دو گے تو تمھارا وزن ...نہیں ہو جائے گا۔''

واحد بھائی بڑبڑاتے ہوئے باورچی خانے میں گئے، گڈو کے لیے بڑی بے دلی ...مانا نکالا اور کمرے میں لے جا کر اس سے کہا: ''لو ٹھونس لو۔''

گڈو نے ان کی بات ٹھیک سے سنی نہیں یا پھر وہ ایسی باتوں کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ ...یلنے میں مگن تھا، کہنے لگا: ''بس بھائی صاحب! ایک بلا رہ گئی ہے، اسے مار کر کھاؤں گا۔''

واحد بھائی حیرت سے بولے: ''کالے جن! کس بلا کو مار کر کھاؤ گے؟''

گڈو ان کی بات سن کر ہنسا: ''میرا مطلب ہے بھائی صاحب! میں گیم والی بلا کو ...کھانا کھاؤں گا۔''

واحد بھائی دانت پیس کر کہنے لگے: ''تمھارا کوئی بھروسا نہیں ہے، کچھ بھی ...سکتے ہو۔''

وہ گیم کھیل کر کھانے کی طرف متوجہ ہوا تو واحد بھائی نے اسے بلا لیا: ''گڈو! ...کھانا کھالو اور مجھے ذرا کمپیوٹر پر بیٹھنے دو۔ اب تک ایک بار بھی نہیں بیٹھا۔''

گڈو نے کھانے کی طرف سے توجہ ہٹائی: ''بھائی صاحب! آپ کو کمپیوٹر چلانا ...ہے؟''

واحد بھائی نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں تو، لیکن کسی نہ کسی طرح چلا لوں گا۔ تم ...، چار دن سے بیٹھے بیٹھے تمھارے جسم کی چربی بڑھ گئی ہوگی۔ تمھیں چلتے پھرتے ...ئے چار دن چار راتیں گزر گئی ہیں۔''

گڈو نے آنکھوں کے سامنے انگلی ہلاتے ہوئے کہا: ''نہ، نہ، جب تک آپ کو

کمپیوٹر چلانا نہیں آئے گا، میں بیٹھنے نہیں دوں گا۔ ورنہ یہ خراب ہو جائے گا۔''

''ارے! جب تک بیٹھوں گا نہیں تو سیکھوں گا کیسے؟ کیا ایسے ہی خود بخود جادو سے چلانا آجائے گا۔'' واحد بھائی پھٹ پڑے۔ یہ سن کر گڈو نے دروازے کی طرف منہ کیا اور زور سے آواز لگائی: ''باجی...... او باجی!''

آواز پر باجی چراغ کے جن کی طرح دروازے پر نمودار ہو گئیں: ''کیا ہوا میرے لاڈلے؟''

مکّار گڈو رونے جیسی آواز بنا کر بولا: ''باجی! یہ مجھے کمپیوٹر پر بیٹھنے نہیں دے رہے ہیں۔''

بیگم صاحبہ نے کچھ کہنے کے بجائے واحد بھائی کو خونی نظروں سے دیکھا۔ واحد بھائی کا خون خشک ہو گیا۔ بوکھلاہٹ کے مارے اور کچھ نہ سوجھا تو گڈو کے بالوں میں کنگھی کرنے لگے اور کھسیائے ہوئے انداز میں کہنے لگے: ''ارے میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میں نے تو صرف اتنا کہا کہ تم سدا کے بھوکے ہو کھانا کھالو۔ پھر آرام سے بیٹھ جانا۔ میں نے منع کب کیا ہے۔''

بیگم صاحبہ نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا: ''اب اگر میرے گڈو کی آواز آئی تو پھر سوچ لینا۔''

یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔ گڈو نے واحد بھائی کا منہ چڑایا اور میز پر ہی کھانا کھاتے ہوئے کمپیوٹر پر گیم کھیلنے لگا۔

☆☆☆

دوسرے دن واحد بھائی دفتر جانے کے لیے جیسے ہی باہر نکلے۔ دروازے پر کھڑا فقیر بولا: ''کہاں جا رہے ہو بابا؟ بابا! میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ تمھارے گھر سے مجھے کوئی بڑی چیز ملنے والی ہے۔''

''بڑی چیز!'' واحد بھائی حیرت سے اسے دیکھنے لگے: ''بڑی چیز تو صرف آٹے کی بوری ہے اور وہ بھی خالی۔ لا دوں؟''

''بابا! میرے خواب سچے ہوتے ہیں۔'' فقیر نے پُر امید انداز میں کہا۔

''چلو ہٹو سامنے سے...... دیر ہو رہی ہے۔'' واحد بھائی یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ آفس میں بے دلی سے کام کیا۔ شام کو جب گھر لوٹے تو یہ دیکھ کر ان کا دل خون ہو گیا کہ گڈو اب تک کمپیوٹر کے آگے بیٹھا تھا اور برابر میں خالی برتن رکھے ہوئے تھے۔

واحد بھائی نے آگے بڑھ کر کہا: ''آج پانچ روز ہو گئے ہیں گڈو! اب تو مجھے کمپیوٹر چلانے دو۔ تم پھر بیٹھ جانا۔''

اچانک ہی کمپیوٹر سے ایک عجیب سی آواز آئی اور وہ بند ہو گیا۔ گڈو کے منہ سے نکلا: ''یہ کیا ہو گیا؟''

واحد بھائی کا چہرہ کھل اُٹھا: ''ارے واہ! اس کا مطلب ہے کہ کمپیوٹر خراب ہو گیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔''

گڈو کا چہرہ پپیتے کی طرح لٹک گیا پھر وہ چیخا: ''باجی!''

اگلے ہی لمحے باجی نمودار ہو گئیں: ''کیا ہوا ہے گڈو؟''

گڈو رونی صورت بنا کر بولا: ''باجی! کمپیوٹر خراب ہو گیا۔''

واحد بھائی نے مداخلت کی: ''خراب تو ہونا ہی تھا، پانچ دن سے مسلسل چل رہا ہے۔''

بیگم صاحبہ نے ڈانٹتے ہوئے کہا: ''تو کیا ہو گیا۔ جا کر جلدی سے ٹھیک کروا لاؤ۔ دیکھتے نہیں میرے بھائی کی کیسی شکل ہو گئی ہے۔''

واحد بھائی نے گڈو کو غور سے دیکھ کر کہا: ''اور منحوس ہو گئی ہے۔'' پھر جلدی سے بولے: ''ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔'' وہ دل ہی دل میں گڈو کو کوستے ہوئے اُٹھے، کمپیوٹر کی تاریں نکال کر اسے کندھے پر رکھا اور باہر چل پڑے۔

تین گھنٹے میں کمپیوٹر ٹھیک ہوا۔ جاننے والا آدمی تھا۔ اس لیے زیادہ وقت نہیں لگا۔ البتہ واحد بھائی کے پانچ سو روپے کھڑے کھڑے خرچ ہو گئے۔ دوبارہ کمپیوٹر اُٹھائے گھر آئے تو دیکھا گڈو اسی کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا ہے۔

''یہ لو، آ گیا کمپیوٹر۔'' واحد بھائی نے کمپیوٹر میز پر رکھ دیا۔

گڈو آواز سن کر چونکا اور کمپیوٹر دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس نے ایک زبردست نعرہ لگایا: ''آ گیا، آ گیا میرا کمپیوٹر آ گیا۔''

''یہ کمپیوٹر آ تو گیا ہے، خبردار اسے فوراً نہیں چلانا، ورنہ پھر خراب ہو جائے گا۔ پانچ سو روپے خرچ ہوئے ہیں۔'' واحد بھائی نے گڈو کو آڑے ہاتھوں لیا۔

''پھر تم نے میرے لاڈلے کو منع کیا۔'' بیگم صاحبہ اندر آتے ہوئے بولیں۔

''پانچ سو روپے خرچ ہوئے ہیں پورے۔ مسلسل کمپیوٹر چلا کر بیڑا غرق کر دیا اس کا۔''

''تو کیا ہو گیا؟ قیامت تو نہیں آئی؟ کچھ دن کے لیے تو آیا ہے میرا بھائی۔ کون سا روز روز آتا ہے۔ چلا لو گڈوا کمپیوٹر چلا لو۔ دیکھتی ہوں کون منع کرتا ہے۔''

اور واحد بھائی دیکھتے رہ گئے۔ گڈو دوبارہ گیم کے لیے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

''اللہ کے نام پر بابا!'' واحد بھائی کے گھر سے نکلتے ہی فقیر لپک کر آیا۔

''تم ابھی تک گئے نہیں؟'' واحد بھائی نے حیرت سے پوچھا: ''لگتا ہے مجھ سے جائیداد ہتھیا کر ہی جاؤ گے۔''

''بابا! کل بھی میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میں یہاں سے کوئی بڑی چیز لے جا رہا ہوں۔''

''کیا بڑی چیز؟ بڑی چیز کی رٹ لگائی رکھی ہے۔ میرے گھر میں مگر مچھ ہے کیا؟'' واحد بھائی نے تلملا کر کہا اور آگے بڑھ گئے۔ دفتر میں وہ بھی پریشان بیٹھے رہے۔ سلیم بھائی ان کے پاس آئے اور پوچھا: ''لگتا ہے آپ کوئی بے وقوفی کر کے پریشان ہیں۔''

واحد بھائی نے جواب دیا: ''ٹھیک کہا آپ نے۔'' اس کے بعد انھوں نے کمپیوٹر اور گڈو کی تفصیل بتائی۔ سلیم بھائی ہنس کر بولے: ''اتنی سی بات پر پریشان ہو رہے ہیں۔ پہلے بتایا ہوتا تو کب کا مسئلہ حل کر دیتا۔''

پھر سلیم بھائی اپنی میز کے پاس گئے اور دوبارہ آ کر بولے: ''پڑیا رکھ لیں۔ اپنے گڈو کی چائے میں ملا دیجیے گا۔ مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

واحد بھائی نے کاغذ کی پڑیا جیب میں رکھ لی۔ شام کو گھر آئے تو دروازے پر فقیر کو پُر امید بیٹھے دیکھا۔ اندر گئے تو گڈو کو کمپیوٹر پر گیم کھیلتے دیکھا۔

واحد بھائی نے کہا: ''لگتا ہے اس مہینے بجلی کا بل نہیں بلکہ کوئی بلا آئے گی۔''

گڈو نے ان کی بات پر توجہ دیے بغیر کہا: ''بھائی صاحب! بڑا زبردست گیم چل رہا ہے۔ میں نے بلا ماردی ہے۔''

واحد بھائی دبے لفظوں میں بولے: ''اب میں بن مانس ماروں گا، صبر کرو۔'' پھر گڈو سے پوچھا ''چائے چلے گی گڈو لاڈلے؟''

گڈو نے یہ بات توجہ سے سنی: ''بالکل، بالکل چلے گی۔ کڑک چائے ملائی والی۔''

بیگم صاحبہ حسب معمول آرام فرما رہی تھیں۔ آدھے بچے باہر تھے اور آدھے دن سے پٹ پٹا کر گہری نیند سو چکے تھے۔ بچے بغیر ان کو نیند نہیں آتی تھی۔ واحد بھائی خود ہی باورچی خانے میں گئے اور کڑک چائے بنائی۔ گڈو کے کپ میں انھوں نے سلیم بھائی کی دی ہوئی پڑیا کا سفوف ملا دیا اور چمچے سے اچھی طرح حل کر دیا۔

''لو گڈو بادشاہ! چائے'' واحد بھائی نے اس کے سامنے چائے کا کپ رکھ دیا۔ اس طرح گڈو نے چائے پی لی۔ واحد بھائی اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک گیم کھیلتے کھیلتے گڈو کو جھٹکا لگا اور چہرے پر تکلیف کے آثار اُبھر آئے۔ واحد بھائی سیدھے ہو گئے۔

''آئے اللہ!'' گڈو نے کی بورڈ پر سے ہاتھ ہٹا کر پیٹ پکڑ لیا۔

''کیا ہوا لاڈے؟'' واحد بھائی نے فوراً ہمدردی جتائی۔

''اوئی...... آئے...... مر گیا......'' گڈو بلبلا کر کھڑا ہو گیا پھر فوراً بیٹھ گیا: ''میرا پیٹ......''

''ہاں دیکھا ہے، بہت بڑا پیٹ ہے۔'' واحد بھائی نے جواب دیا۔

''گڑ بڑ ہو رہی ہے۔'' گڈو کراہا۔

''چھے دن سے بیٹھے ہوئے ہو، گڑ بڑ تو ہو گی۔''

''آ آ آئے'' گڈو اچانک باہر بھاگا۔

واحد بھائی نے آواز لگائی: ''اُدھر کہاں جا رہے ہو؟ وہاں تو باورچی خانہ ہے باتھ روم سیدھے ہاتھ پر ہے۔ فوراً وہاں جاؤ۔''

''شکریہ...... آ آ آ آ......'' وہ شکریہ کرتا ہوا بھاگا اور واحد بھائی نے سلیم بھائی کو دعا دی۔ پھر وہ تیزی سے اُٹھے کمپیوٹر بند کر کے تار نکالے اور سارا سامان اُٹھا کر گلی کا دروازہ کھولا۔ باہر بیٹھا فقیر ایک دم ہوشیار ہو گیا۔ واحد بھائی نے اسے آواز دی: ''یہ لو بھائی! بڑی چیز ہے۔''

فقیر دوڑا ہوا آیا۔ اس نے ماؤس اور کی بورڈ گلے میں لٹکایا، ایک بغل میں سی پی یو اور دوسری بغل میں مانیٹر دبا کر روانہ ہو گیا۔ واحد بھائی کو ایسا لگا ان کے سر سے بڑا بوجھ اُتر گیا ہے۔

وہ خوش خوش اندر آئے تو دیکھا کہ گڈو باتھ روم سے باہر آ رہا ہے۔

''اب گڑ گڑ کیسی ہے؟'' واحد بھائی نے اس کے شانے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔

گڈو نڈھال ہو رہا تھا، بولا: ''ہائے...... ہائے...... اُوف...... اُوئی......''

دوبارہ وہ پھر باتھ روم کی طرف بھاگا۔ واحد بھائی اپنے اس مشن پر کام یابی سے سیٹی بجاتے ہوئے کمرے کی طرف چل پڑے۔ ☆

استاد کا وار

ماریہ ایمن

جب شہزادہ بڑا ہو گیا تو بادشاہ نے اس کے لیے ماہر استادوں کا بندوبست کیا، وں نے بڑی محنت سے اسے تمام ہنروں میں ماہر کر دیا۔ سپہ گری کے گُر سکھانے والے د نے اسے تلوار بازی، نیزہ بازی اور تیر اندازی کے سب داؤ پیچ سکھا دیے تو ادے نے سوچا کہ اب ان داؤ پیچ کو آزمانا چاہیے۔ آزمائشی طور پر اس نے فوج کے کئی والوں سے مقابلہ کیا۔ مقابلہ کرنے والوں کو کچھ تو شہزادے کی ولی عہدی کا احترام تھا ر کچھ واقعی شہزادے کی مہارت تھی کہ کوئی بھی اسے پچھاڑ نہ سکا تھا۔ ایک ایک کر کے جب بہت سے لوگوں سے مقابلہ جیت چکا تو اس نے اعلان کر دیا کہ جو بھی چاہے اس کے بلے میں آ جائے۔

بہت دن گزر گئے۔ کوئی بھی اس کے مقابلے پر نہ آیا تو اس نے اپنے استاد کو بلے کی دعوت دے دی۔ لوگوں نے اور بادشاہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے اد کی عزت برقرار رہنے دے اور اس کے مرتبے کا لحاظ رکھے، لیکن اس کو ضد تھی کہ وہ بلہ کرے گا تو اپنے استاد سے۔ شہزادے کا کہنا تھا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا استاد تمام گُر مجھے سکھا دیے ہیں یا کوئی گُر اپنے پاس بچا کر بھی رکھا ہوا ہے۔

شہزادے کو لوگوں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ استاد، استاد ہوتا ہے۔ وہ نئے گُر ایجاد کر سکتا ہے، لہٰذا تم اپنے استاد کا مقابلہ کرنے کا خیال دل سے نکال دو، مگر وہ مانا۔ آخر اس کے باپ نے استاد سے کہا کہ وہ مقابلے کی تیاری کرے۔ اس کا شاگرد سے مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ استاد نے کہا: ''جیسا حکم عالی جاہ! مجھے مقابلے کی تیاری کے تین مہینے کی مہلت چاہیے۔'' چناں چہ اسے تین مہینے کی مہلت دے دی گئی۔

شہزادے نے اپنے جاسوس استاد کے پیچھے لگا دیے، جو اسے استاد کی پل پل کی مصروفیات سے باخبر کرتے رہتے تھے۔ جاسوسوں نے شہزادے کو اطلاع دی کہ استاد نے لوہار کو سات گز لمبی تلوار تیار کرنے کا حکم دیا ہے، جس کا وزن ایک من ہوگا۔ شہزادہ سمجھ گیا کہ استاد اس سے سات گز دور رہ کر مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے بھی فوراً حکم دیا کہ دس گز لمبی اور ڈیڑھ من وزنی تلوار تیار کی جائے۔ پھر اطلاع ملی کہ استاد نے سات گز لمبی میان تیار کروائی ہے۔

شہزادے نے بھی دس گز لمبی تلوار کے لیے دس گز لمبی میان بنوانے کا حکم دیا۔ پھر اطلاع ملی کہ استاد کی سات گز لمبی تلوار تیار ہو کر آ گئی ہے اور اب وہ اسے چلانے کی دن رات مشق کر رہا ہے۔ شہزادے نے بھی دس گز لمبی تلوار کو چلانے کی مشق شروع کر دی۔

غرض اسی طرح تین مہینے پورے ہو گئے اور مقابلے کا دن آن پہنچا۔ آخری وقت بھی عقل مندوں نے شہزادے کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی ضد سے باز آ جائے۔ اگر شاگرد جیت گیا تو استاد کی بے عزتی ہوگی اور استاد جیت گیا تو شہزادے کی عزت پر حرف آئے گا، لیکن شہزادے پر استاد سے مقابلے کا بھوت سوار تھا۔ اس نے کسی کی بھی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

مقابلے کا اہتمام شہر کے وسیع و عریض میدان میں کیا گیا۔ قرب و جوار سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ استاد اور شاگرد کا مقابلہ دیکھنے کے لیے آ گئے۔

بعض لوگوں نے شرطیں بھی لگا رکھی تھیں کہ استاد اور شاگرد میں سے کون جیتے گا اور کون ہارے گا؟ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ شاگرد لمبی تلوار کی مدد سے استاد پر ایک ہی وار کرے گا اور مقابلہ ختم ہو جائے گا۔ جب کہ بعض لوگ اس سے متفق نہ تھے ان کا کہنا تھا: ''استاد، استاد ہوتا ہے۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے؟''

آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ نقارے بجائے گئے۔ ایک جانب سے استاد سات گز کی میان کمر سے لٹکائے اطمینان سے چلتا ہوا میدان میں اُترا۔

دوسری جانب سے شاگرد شہزادہ دس گز کی میان لٹکائے، بلکہ زمین پر گھسیٹتے ہوئے میدان میں اُترا۔ شہزادہ، اپنے استاد کی نقالی میں اپنی چال سے اطمینان ظاہر کرنا چاہتا تھا، لیکن تلوار کے وزن کے باعث وہ مشکل میں نظر آ رہا تھا۔ دس گز کی تلوار کا وزن ڈیڑھ من تھا۔ اس کے علاوہ دس گز کی میان کا وزن بھی آدھے من کے قریب تھا۔ یوں دو من کا وزن لے کر اطمینان سے چلنا ممکن ہی نہ تھا۔

استاد اور شاگرد میدان میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے پہنچ چکے تھے۔ استاد دونوں پیر پھیلا کر سات گز کی میان کے بوجھ کو آسانی سے سنبھالے انتہائی اطمینان سے کھڑا تھا، جب کہ شاگرد شہزادہ دو من کا بوجھ تھامے بڑی مشکل سے کھڑا تھا، مگر چہرے سے

اطمینان ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہزادہ فاتحانہ انداز میں تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھے مسکرا رہا تھا، گویا کہہ رہا ہو کہ تمھاری سات گز کی تلوار کا میری دس گز کی تلوار سے کیا مقابلہ؟ تم کیا سمجھتے ہو مجھ پر سات گز دور سے وار کرو گے؟

مقابلہ شروع ہونے کا نقارہ بجا۔

شاگرد نے تیزی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے دس گز کی تلوار نکالنا شروع کی۔

تماشائیوں نے دیکھا کہ شاگرد شہزادہ تلوار نکالتا جا رہا تھا اور تلوار کا دستہ اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ جب ساری تلوار میان سے باہر نکل گئی تو اس کا دستہ شہزادے کے ہاتھ سے دس گز دور جا چکا تھا۔ شہزادے کی پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے تھے۔ دوسری جانب استاد نے ابھی تک اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور تلوار باہر نہیں نکالی تھی، تاہم اس کے اطمینان میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ گویا شاگرد کو بھرپور موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ اپنی دس گز کی تلوار سے استاد پر پہلا وار بھی کر ڈالے۔

اب شہزادے نے دونوں ہاتھوں سے تلوار کو گھما کر دستہ اپنی جانب کرنا چاہا۔ جب دس گز کی تلوار ترازو کی طرح آدھی اِدھر اور آدھی اُدھر ہوئی، تو استاد نے بڑی پھرتی سے اپنی سات گز کی میان میں سے سات گز کے بجائے صرف ایک گز کی عام سی تلوار نکالی اور شاگرد شہزادے کی گردن پر رکھ دی۔ یہ گویا اس کی استادی تھی، جو شاگرد کے خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔

شہزادے کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ دس گز کی تلوار دونوں ہاتھوں پر پکڑا رہ گیا۔ مقابلہ شروع ہوتے ہی ختم ہو چکا تھا۔ تماشائیوں نے داد و تحسین کے ڈونگرے برسانا شروع کر دیے۔ ہر جانب سے ایک ہی آواز آئی: ”واقعی استاد، استاد ہوتا ہے۔“ ☆

سب سے سچا جھوٹ

ڈاکٹر عمران مشتاق ۔ یو کے

ایک بادشاہ کے پاس کوئی کام نہیں تھا، اس لیے وہ بہت جلدی بور ہو جاتا تھا۔ اُسے خوش کرنے کے لیے اُس کا وزیر طرح طرح کے جتن کرتا۔ کھیل تماشے کا اہتمام کرتا، جادوگروں اور شعبدے بازوں کو محل میں بلایا جاتا۔ شاعروں کو دعوت دی جاتی کہ وہ بادشاہ کی شان میں قصیدے پڑھیں۔ گانے بجانے والے گویے آکر بادشاہ کو خوش کرنے کی کوشش کرتے اور اُنھیں اُمید ہوتی کہ بادشاہ سلامت خوش ہو کر انعام و اکرام سے نوازیں گے۔

اس وقت دربار میں محفل جمی ہوئی تھی۔ ایک شاعر بادشاہ کی تعریفوں کی پُل باندھ رہا تھا، مگر بادشاہ خوش ہونے کے بجائے بڑی کوشش کر رہا تھا کہ اُس کی جمائیاں رُک

جائیں۔ وہ سخت بور ہو رہا تھا۔ جب اُس سے مزید برداشت نہ ہوا تو پاس بیٹھے وزیر سے سرگوشی کرنے والے انداز میں کہنے لگا: ''اِس بے وقوف شاعر کو کس نے بتا دیا کہ ہم نے کئی ملک فتح کیے ہیں۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ جب پڑوس کا بادشاہ اپنی فوج کو لے کر ہماری سرحدوں کی جانب بڑھا تھا تو ہم نے بہت سارا سونا اور غلہ دے کر اپنی اور اپنی عوام کی جان بچائی تھی۔''

وزیر نے بھی سرگوشی میں ہی جواب دیا: ''حضور کا فرمانا بالکل دُرست ہے۔ پھر بھی آپ کی شان کا بیان سب کے سامنے ضروری ہے تاکہ آپ کی بہادری، دانش مندی اور حوصلہ مندی کا چرچا ہو۔''

بادشاہ نے منھ بنایا: ''خاک چرچا ہوتا ہے۔ میں نے تو سُنا ہے کہ عوام میری غیر موجودگی میں بادشاہ مُردہ باد کے نعرہ لگاتے ہیں۔''

وزیر نے بادشاہ کے موڈ کا اندازہ لگاتے ہوئے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ اُس نے اشارہ کیا تو شاعر اپنے قصیدے سمیت فوراً وہاں سے رخصت ہو گیا۔

شاعر کے بعد گانے والا درباری آگے بڑھا اور اپنی پاٹ دار آواز میں بادشاہ کا پسندیدہ ایک گیت الاپنے لگا۔

بادشاہ پھر وزیر کی جانب جھکا اور بولا: ''یہ گیت میں بیالیس مرتبہ پہلے بھی سُن چکا ہوں۔ کیا یہ کوئی نیا گیت پیش نہیں کر سکتا۔''

وزیر بڑے ادب سے بادشاہ کی گنتی ٹھیک کرتے ہوئے بولا: ''حضور والا! میرا خیال ہے کہ آپ یہ گیت کم سے کم چوالیس بار سُن چکے ہیں۔''

بادشاہ نے بے زاری سے ہاتھ اُٹھایا اور کہا: ''اِس کو روکو ورنہ یہ ہمیں گیت پچاس بار سُنا کر ہی دم لے گا۔''

وزیر کے اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ منظر بدل گیا۔ اب درباری مسخرہ لطیفوں کا پٹارہ لے کر آیا، لیکن بادشاہ کی بوریت وہ بھی دور نہ کر سکا۔

دربار برخواست کرنے کے بعد بادشاہ اپنے وزیر سے بولا: ''ہمارے عوام کو خوش ہونا چاہیے کہ اُنھیں اللہ نے ایک ایسا بادشاہ دیا ہے جس کی لمبی عُمر کی وہ دُعا کر سکتے ہیں اور اسے خوش کرنے کی تدبیریں کرتے رہنا چاہیے۔ اب ہمیں سارا دن کوئی کام تو ہوتا نہیں، بس بیٹھے بور ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری اُکتاہٹ دور ہو۔''

وزیر بولا: ''حضور والا نے بالکل بجا فرمایا۔ عوام کا تو کام ہی یہ ہے کہ حضور کی لمبی عُمر کی ہر دم دُعا کرتے رہیں۔''

بادشاہ نے کہا: ''کیا تمھیں یقین ہے کہ عوام ہر دم ہماری عُمر بڑھانے کے لیے دعاؤں میں مصروف رہتے ہیں۔''

وزیر نے جھکتے ہوئے ادب سے کہا: ''حضور! اس میں تو شک کی کوئی بات ہی نہیں۔'' لیکن وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر بادشاہ کو یہ پتا چل جائے کہ لوگ اُس سے اتنے تنگ ہیں کہ اُس کا نام سُنتے ہی کوسنے دینے لگتے ہیں تو نہ جانے اُس کی کیا حالت ہو؟

بادشاہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے حکم جاری کیا: ''اب تُم جلدی سے کوئی انتظام کرو کہ ہماری اُکتاہٹ کا خاتمہ ہو۔''

وزیر تھوڑی دیر کے لیے تو سوچ میں پڑ گیا۔ یہ اُس کی جان کو ایک مستقل بیماری تھی کہ بادشاہ کی اُکتاہٹ دور کرنے کے لیے ہر دم کُچھ نہ کُچھ کرتا رہے۔

وزیر اچانک ہی جوش میں آ گیا اور کہنے لگا: ''حضور والا! ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے۔ کیوں نہ آپ کی وہ تصویر جو آپ نے خود بنائی تھی اور جس کا فریم سونے کا ہے، کسی ایسے شخص کو انعام کے طور پر دے دی جائے، جو آپ کی اُکتاہٹ دور کر دے۔''

بادشاہ کو ایک بار اُکتاہٹ کے عالم میں مصوری کا شوق ہوا تھا۔ اُس نے دو تین تصویریں بنائیں تھیں، جس میں ایک اُس کی اپنی بھی تھی۔ بعد میں اُس کے حکم پر تصویر پر سونے کا فریم چڑھا کر اُنھیں شاہی نوادرات میں شامل کر لیا گیا تھا۔

یہ سن کر بادشاہ خوش ہوا: ''ہاں کوئی ایسا مقابلہ کراؤ کہ اُکتاہٹ اور بدمزگی سے تو نجات ملے۔''

اگلے ہی دن ساری سلطنت میں منادی کروا دی گئی کہ جو شخص سب سے بڑا جھوٹ بولے گا، اُسے بادشاہ کی سونے کے فریم والی تصویر انعام میں دی جائے گی اور اُس پر بادشاہ سلامت اپنے دستخط بھی کریں گے۔''

مقابلے والے دِن بادشاہ کا محل سیکڑوں لوگوں سے بھر گیا۔ مقابلے کا آغاز ایک بوڑھا آدمی پیش ہوا اور کہا: ''میں دو گھوڑوں کو اپنی بغل میں دبا کر دس میل تک

دوڑ سکتا ہوں۔'' اُس کا حال یہ تھا کہ چند قدم بھی اُٹھاتا تو تھک کر ہانپنے لگتا۔

ایک عورت کا جھوٹ تھا کہ وہ بیس سیر دودھ ایک وقت میں پی جاتی ہے اور چار سیر بُھنا ہوا گوشت منٹوں میں چٹ کر جاتی ہے اور اُس کا شوہر اُس کی اِس عادت سے تنگ ہے۔

بادشاہ نے اُس بے حد موٹی عورت کو دیکھتے ہوئے، وزیر کے کان میں کہا: ''جھوٹ تو نہ ہوا۔ اگر کوئی عورت اتنی پیٹو ہو تو اُس کا غریب شوہر تو اُس سے تنگ ہو گا ہی۔''

ایک نوجوان کا سب سے بڑا جھوٹ یہ تھا کہ وہ دِن میں چوبیس گھنٹے سویا رہتا اور اب بھی سو رہا ہے۔ یہ کہتے ہی وہ زمین پہ لیٹ گیا اور خرّاٹے لینے لگا۔

بادشاہ اچانک غُصّے سے چلّایا: ''بند کرو یہ بکواس۔ کیا لغویت پھیلا رکھی ہے۔ بھاگو یہاں سے۔''

بادشاہ کو غُصّے میں دیکھ کر سب لوگ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔ اب وہاں بادشاہ اور وزیر کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا۔

بادشاہ کافی ناراض نظر آ رہا تھا، وہ بولا: ''اب تُم بھی جاؤ۔ یہ فضول مقابلہ ختم ہوا۔''

بادشاہ کا حکم سُن کر وزیر جو جانے ہی لگا تھا کہ ایک آواز سن کر اُسے رُکنا پڑا۔ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی، جو کہہ رہی تھی: ''مقابلہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی میں باقی ہوں۔''

بادشاہ اور وزیر دونوں چونک کر اُس کی جانب دیکھنے لگے۔ وہ لڑکی بڑے اعتماد کے ساتھ بولی: ''بادشاہ حضور! میں اِس لیے حاضر ہوئی ہوں کہ آپ سے اپنے قرض کا تقاضا کروں۔''

بادشاہ اُس کی بات سُن کر حیران رہ گیا۔ ''کیسا قرض؟''

لڑکی نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: ''میری ایک ہزار سونے کی اشرفیاں جو آپ نے مجھ سے لی تھیں۔''

بادشاہ کی حیرت قائم تھی: ''کیسی اشرفیاں! میں نے تو آج سے پہلے تمھیں دیکھا بھی نہیں۔''

''اِس کا مطلب ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں؟''

''بالکل تُم جھوٹی ہو۔ دُنیا کی سب سے بڑی جھوٹی۔ اب بادشاہ بھی چھوٹے لوگوں سے قرضے لیں گے؟''

لڑکی بادشاہ کی بات سُن کر ایک دم خوش ہو گئی: ''بادشاہ سلامت! لائیے میرا انعام۔ آپ نے خود ہی مجھے دُنیا کی سب سے جھوٹی لڑکی کا خطاب دیا ہے۔''

بادشاہ اُس کی بات سُن کر ایک دم سناٹے میں آ گیا۔ ''ارے تُم تو بہت ہوشیار ہو۔ واہ مان گئے۔''

بادشاہ نے وزیر کو اپنا کان قریب لانے کا اشارہ کیا اور کہا: ''بڑی ہی ہوشیار لڑکی ہے۔ اگر ہم اِسے انعام نہ دیں تو یہ عوام میں جا کے ہماری نیک نامی خطرے میں ڈال سکتی ہے۔''

وزیر نے باشاہ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا: ''آپ بالکل صحیح فرما رہے ہیں۔ اگر ہم اِس لڑکی کا قرضہ چکاتے ہیں تو ہمیں ایک ہزار اشرفیاں دینی پڑتی ہیں اور اگر انعام میں اُسے آپ کی سونے کے فریم والی تصویر دیتے ہیں تو ہم گھاٹے میں نہیں رہیں گے، کیوں کہ تصویر پہ کُل لاگت پانچ سو اشرفیاں آئی تھی۔''

اپنے عقل مند وزیر کی تجویز سُن کر بادشاہ بہت خوش ہوا کہ اُس کی عقل مندی کی وجہ سے شاہی خزانے کو پانچ سو سونے کی اشرفیوں کا فائدہ ہوا تھا۔ بادشاہ کی ہدایت پہ لڑکی کو اُس کا انعام دے دیا گیا۔ وزیر کا خیال تھا کہ بادشاہ کیا اُکتاہٹ ختم ہو گئی ہو گی، مگر ایسا نہیں تھا۔ بادشاہ درحقیقت، لڑکی کے بے وقوف بنانے پہ بدمزہ ہو کر رہ گیا تھا۔ ابھی وہ کھڑا منھ

ہی بنا رہا تھا کہ اچانک اِک شور سا اُٹھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادشاہ کو درجنوں سپاہیوں نے گھیر لیا۔ اُن کے ساتھ بادشاہ کا سپہ سالار بھی تھا۔ سپہ سالار کو جھوٹ بولنے کی عادت تھی۔ وہ گپ باز کے طور پہ مشہور تھا۔

بادشاہ نے اپنے اردگرد اتنے بہت سارے سپاہیوں کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا: ''سپہ سالار! یہ سب کیا ہے؟''

سپہ سالار بے خوفی سے بولا: ''حضورِ والا! آپ کی سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا گیا ہے۔''

بادشاہ نے مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے کہا: ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اُس لڑکی کے بعد اب تُم بھی جھوٹ بول رہے ہو۔ تم تو جھوٹے مشہور بھی ہو۔''

سپہ سالار اِس بار درشت لہجے میں بولا: ''میں جھوٹا تھا، مگر آج سچ بول رہا ہوں۔ اِس جھوٹے کا سب سے بڑا سچ یہ ہے کہ اب آپ بادشاہ نہیں رہے۔ جب آپ شاہی قید خانے میں چکی پیسیں گے تو ساری اُکتاہٹ اور بدمزگی دور ہو جائے گی۔''

سپہ سالار مزید کہنے لگا: ''آپ نے ساری زندگی سوائے بیٹھ کے کھانے اور عیش کرنے کے کوئی کام نہیں کیا۔ عوام کے لیے کوئی مفید کام نہیں کیا۔ جب انسان کوئی کام نہ کرے تو پھر بور ہونے کے سوا اور وہ کر ہی کیا سکتا ہے؟ ہم نے آپ کی اُکتاہٹ دور کرنے کا انتظام کر لیا ہے۔ شاہی قید خانہ آپ کا منتظر ہے۔''

بادشاہ کو جب دھکا دے کر آگے بڑھایا گیا تو اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا تو اچانک اُس کے پیروں کے نیچے کوئی چیز آ گئی۔ غور سے دیکھا تو وہ اُس کی اپنی ہی تصویر تھی، جو خود اس نے بنائی تھی۔ بادشاہ نے دیکھا کہ جس لڑکی کو اُس نے سونے کے فریم والی تصویر بطور انعام دی تھی وہ خالی سونے کا فریم لیے ہنستی مسکراتی محل سے باہر نکل رہی ہے۔

چھیل چھبیلی رانی آئی

فراغ روہوی

متوالی مستانی آئی
پھولوں کی دیوانی آئی
پھر ست رنگی پر پھیلائے
چھیل چھبیلی رانی آئی

آیا کیا پھولوں کا موسم
اِتراتی وہ آئی پیہم
آتے ہی گلشن میں دیکھو
ٹوٹ پڑی پھولوں پہ اِک دم

ڈالی ڈالی گھوم رہی ہے
پھولوں کے لب چوم رہی ہے
بھینی بھینی خوشبو پا کر
پھر مستی میں جھوم رہی ہے

اُڑ اُڑ جانے والی تتلی
سو بَل کھانے والی تتلی
اس کو پکڑنا بھی چاہو تو
ہاتھ نہ آنے والی تتلی

جوتے کی فریاد

مسعود احمد برکاتی

میں جوتا ہوں۔ جی ہاں، وہی جوتا جو ہر وقت آپ کے پیروں کے نیچے رہتا ہے۔ کہنے کو کتنا قریب ہوں، مگر آپ سے بہت دور ہوں۔ کوئی میری نہیں سنتا۔ کوئی مجھے اچھے نام سے یاد نہیں کرتا۔ کہتے ہیں نام میں کیا رکھا ہے، مگر جب اس نام کو ہمیشہ بُری مثال کے لیے، گالی کے لیے، طعنے کے لیے استعمال کیا جائے تو پھر آپ کا یہ کہنا کہ نام میں کیا رکھا ہے کب صحیح ہوا۔ ویسے میرے اور بھی کئی نام ہیں۔ مجھے جوتی بھی کہتے ہیں۔ مجھے آج تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ جوتا اور جوتی میں کیا فرق ہے۔ آپ لوگ مجھے کبھی مرد سمجھتے ہیں اور کبھی عورت۔ اگر یہ ہوتا کہ مرد جب پہنیں تو میں جوتا کہلاؤں اور عورتیں اپنے پیروں کی زینت بنائیں تو مجھے جوتی کہیں، تو یہ بھی کوئی بات ہوتی، مگر آپ نے یہ امتیاز بھی نہیں رکھا۔ جوتی کے علاوہ مجھے پاپوش بھی کہتے ہیں۔ بعض شاعروں کو پاپوش زیادہ پسند ہے:

جان جائے گی اُن کی جائے گی
میری پاپوش بھی نہ آئے گی

میرا ایک اور نام ہے کفش۔ مولانا الطاف حسین حالی نے کہا ہے:

کمالِ کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے

حالی صاحب تو اگلے وقتوں کے لوگوں میں تھے، اس لیے انھوں نے اپنی مُسدّس میں قوم کی کاہلی اور بے عملی دور کرنے اور ہنر اور کمال کی قدر بڑھانے کے لیے کہہ دیا کہ جوتے سینے کے ہنر میں بھی اگر آدمی کمال پیدا کرے تو یہ اچھی بات ہے۔ گویا ایک ماہر موچی کسی بے عمل عالم سے اچھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج کا کوئی شاعر، جوش میں بھی اور جوش دلانے کے لیے بھی ایسی بات نہیں کہے گا۔

خدا حالی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

بات یہ بھی ہے کہ جناب حالی شاعر ہی نہیں عالم بھی تھے۔ ان کی قرآن پر بھی نظر تھی اور تاریخ کا مطالعہ بھی انھوں نے خوب کر رکھا تھا۔ ان کو معلوم ہوگا کہ جب حضرت موسیٰؑ کوہِ طور پر گئے تو اللہ میاں نے اُن سے فرمایا:

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ط۔ طٰہٰ آیت ۱۲

ترجمہ: تم اس جگہ جوتے اُتار دو۔ اب تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔

گویا طویٰ کی مقدس وادی شروع ہونے تک تو مجھے حضرت موسیٰ کے پاؤں میں ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ ایک بات اور آپ کی توجہ چاہتی ہے۔ قرآن کی اس آیت میں میرے لیے نعل کا نام استعمال ہوا ہے۔ پہلے عربی میں مجھے نعل ہی کہتے تھے، اب حذا کہتے ہیں۔

بہر حال آپ مجھے پاپوش کہیں، کفش کہیں، نعل کہیں، شو کہیں یا کچھ اور، رہوں گا میں آپ کی نظروں میں پیر کی جوتی ہی اور جب کسی چیز کو حد سے زیادہ حقیر، ذلیل کرنا ہو تو آپ اس کو مجھ ہی سے تشبیہ دیں گے۔

زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ میری بہت سی قسمیں ہوگئی ہیں۔ بُوٹ، شو، گرگابی، ملتانی، ناگرا، سلیم شاہی، ملکیشن، سینڈل، چپل، سلیپر، کھڑاؤں اور آج کل تو بہت سے اور بھی نام چل گئے ہیں۔ بُوٹ پر اکبر الٰہ آبادی کا ایک مزے دار شعر یاد آ گیا:

بُوٹ ڈاسن نے بنایا، میں نے ایک مضموں لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

آپ کو تو شاید معلوم نہ ہوگا، ڈاسن جوتے بنانے، بیچنے والی ایک بہت بڑی کمپنی ہوا کرتی تھی۔ اس کے جوتے بہت مشہور تھے۔ لوگ بڑے شوق اور فخر سے پہنتے ـــ

انھوں نے علم کی ناقدری کی طرف اشارہ کیا ہے اور میرے نام سے ایک محاورہ بھی استعمال کیا ہے کہ جوتا چل گیا۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے اس کا مطلب کہ آپس میں لڑائی ہونے لگی، جیسی اکثر آج کل لیڈروں میں ہوتی ہے یا جلسے جلوسوں میں ہوتا ہے کہ مار کٹائی ہونے لگتی ہے۔ ایک شخص دوسرے کو برائی دیتا ہے۔ بات بڑھ جاتی ہے۔ لیڈر تو مزے سے اپنے اپنے گھروں میں یا دفتروں میں بیٹھے رہتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کے گھر دعوتیں اڑاتے ہیں، مگر اُن کے حامی اور ماننے والے آپس میں لڑنے جھگڑنے لگتے ہیں۔ خوب مار پیٹ ہوتی ہے۔ اسی کو جوتم پیزار ہونا کہتے ہیں۔ میرا ایک نام پیزار بھی ہے۔

اب اگر ملک میں مضمون نہ پھیلے، یعنی لوگوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق نہ ہو تو بھلا بتایئے، اس میں میرا کیا قصور ہے۔ کیا میں ان کو روکتا یا منع کرتا ہوں۔ میں تو اُلٹی اُن کی مدد ہی کرتا ہوں۔ جو بچے پڑھنے جاتے ہیں وہ مجھے ہی تو پہن کر جاتے ہیں۔ میں اُن کے پیروں کی حفاظت کرتا ہوں۔

میں اسکول کے بچوں کے پیروں کو ہی تکلیف سے نہیں بچاتا، بلکہ بڑے بڑے لوگوں کے پیروں میں پڑ کر ان کو آگے لے جاتا ہوں۔ ان کو اتنی اونچائی پر پہنچا دیتا ہوں کہ لوگ اُن کی جوتیاں اُٹھانا اپنے لیے قابلِ فخر سمجھتے ہیں، اُن کی جوتیاں سر پر رکھنا عزت کا ذریعہ جانتے ہیں۔ لوگ اُن سے کہتے ہیں کہ آپ کی جوتیاں سیدھی کرنا ہمارے لیے باعثِ عزت ہے۔

آپ کہیں گے تو سہی کہ اپنی تعریف آپ کر رہا ہوں، لیکن اپنا ایک اور کارنامہ ضرور گنواؤں گا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مجھ میں بھی بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ پہلے زمانے میں عورتیں سپاٹ جوتیاں پہنتی تھیں، یعنی جوتوں کی وضع تو عورت مرد سب کے لیے ایک ہوتی تھی، مگر عورتوں کے لیے اپنی جوتیوں کو بھی اسی طرح دبانا ضروری تھا جس طرح ـــ اپنے آپ کو دبا کر رکھنا۔ چناں چہ اپنے جوتوں کی ایڑھیاں بٹھا لیتی تھیں، مگر اب

عورتوں نے جس طرح خودسر اُٹھایا ہے اسی طرح اپنی جوتیوں کو بھی اونچا کرلیا ہے۔اب
اونچی ایڑھی کی جوتیاں پہنتی ہیں جس کو آج کی زبان میں ''ہائی ہیل'' کہتے ہیں۔چار چار
انچ اونچی ایڑھی ہونے لگی ہے اب زنانہ چپلوں کی۔نتیجہ یہ ہے کہ آج کی عورتیں بھی
قد آور معلوم ہونے لگی ہیں اور مرد کی برابری کا دعوا کرنے لگی ہیں۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ
کوئی بیگم صاحبہ کسی محفل میں ہائی ہیل پہنے آتی ہیں تو لوگ اُن کے منھ کے بجائے ان کی
ایڑیاں دیکھ کر خود آپس میں ایک دوسرے کا منھ تکنے لگتے ہیں۔تو دیکھا آپ نے، میں
بدلتے ہوئے حالات اور نئے خیالات کا بھی ساتھ دے رہا ہوں۔اس میں شک نہیں کہ
مجھے اس کا کچھ صلا بھی ملا ہے اور اب میری قدر پہلے سے زیادہ ہونے لگی ہے۔پہلے میری
ایک جوڑی بہت ہوتی تھی، اب آپ لوگ کئی کئی جوڑیاں رکھتے ہیں، لیکن میری شکایت
اپنی جگہ ہے کہ میرا ذکر پھر بھی اچھی طرح نہیں ہوتا اور آپ نے، بلکہ آپ کے بزرگوں نے
بہت سے محاورے بنا رکھے ہیں جن میں وہ میرا نام استعمال کرتے ہیں اور اپنی بات کہنے
کے لیے ان محاوروں کا سہارا لیتے ہیں۔میں غریب مفت میں بدنام ہوتا ہوں اور مجھے ہی
طعنے دیے جاتے ہیں۔بتایئے یہ مضمون جس میں ایک مہرباں نے میرے جذبات اور
احساسات کو زبان دی ہے اور میری فریاد آپ تک پہنچا رہے ہیں اگر لوگ نہ پڑھیں تو اس
میں کس کا قصور ہے۔میں تو خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ملک میں علم پھیلے اور جوتا نہ چلے۔جوتا
چلنے سے تو مجھے ہی تکلیف ہوتی ہے، جس کے جوتا پڑتا ہے اسی کے درد نہیں ہوتا، مجھے بھی
چوٹ لگتی ہے اور پھر میں ٹوٹ بھی جاتا ہوں اور مجھے وہ موچی کے پاس پہنچا دیتے ہیں، جو
بڑی بے دردی سے میری مرمت کرتا ہے۔وہ بھی بے چارہ کیا کرے، موچی ہی
ٹھیرا، جسے لوگ چمار بھی کہہ دیتے ہیں، مگر ذرا ٹھیریے۔اب زمانہ بدل گیا ہے۔اب ترقی
کا دور ہے۔ہر چیز صنعت بن گئی ہے۔جوتے بنانے کی صنعت نے بھی بڑی ترقی کی ہے۔

یہ کوئی حقیر کام نہیں رہا، لوگ جوتے بنا بنا کر صنعت کار بن جاتے ہیں، امیر ہو جاتے
ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح لیڈر جوتا چلوا کر مقبول اور ہر دل عزیز ہو جاتے ہیں اور
وزارت کی کرسی کے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ان صنعت کاروں نے ہماری قدر بھی بہت بڑھا دی
ہے۔نئے نئے ڈیزائن نکالتے ہیں اور بڑے سلیقے سے ڈبوں میں سجا کر رکھتے ہیں۔جب
قیمت بڑھانی ہوتی ہے تو ایک نیا ڈیزائن نکال دیتے ہیں۔گاہک بے چارہ جب دُکان پر
جا کر دام پوچھتا ہے تو اس کا منھ لٹک جاتا ہے، بالکل میری طرح۔مگر کیا کرے اس کو
[illegible]ل میں جوتا خریدنا ہے، وہ ٹوپی لینے تو نہیں آیا۔یہ ٹوپی کا زمانہ نہیں، جوتے کی دنیا
ہے۔غریب سر جھکا کر جوتا پہن لیتا ہے۔

جب آپ مسجد میں جاتے ہیں تو وہاں بھی مجھے دروازے پر چھوڑ کر نہیں جاتے
بلکہ ہاتھ میں لے کر مسجد کے اندر لے جاتے ہیں اور تلاش کر کے محفوظ جگہ رکھتے ہیں، کبھی
[illegible]ل کے آگے۔کیا بھروسا کوئی ہاتھ کی صفائی دکھا دے اور آپ منھ دیکھتے رہ جائیں۔مسجد
عبادت کی جگہ ہے، مگر شاید بعض لوگ بھول جاتے ہیں اور وہاں 'جوتی چھپائی' کی رسم ادا
کرنے لگتے ہیں، حال آنکہ دولھا کے جوتے چھپا کر نیگ لینا تو صرف سالیوں کا حق ہے۔

میں تو آپ کی خدمت کرتا ہوں۔آپ کی عزت بڑھاتا ہوں۔آڑے وقت آپ
کے کام آتا ہوں۔آپ کی زبان کو نئے نئے محاورے دیتا ہوں۔آپ کو آرام پہنچاتا ہوں۔آپ
کو تن درست مند رکھتا ہوں۔آپ کی دولت بڑھاتا ہوں، مگر آپ کا سلوک میرے ساتھ کیا ہے، آپ
خود ہی غور کر لیجیے۔کیا آپ اپنے ہر خادم اور دوست کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں؟ اس سے تو
بہتر ہے آپ میرے جوتے مار لیجیے۔خیر اب میں اپنی آہ و فریاد ختم کرتا ہوں، ورنہ

آپ کے کوچے میں دشمن رات دن
جوتیاں پھرتے ہیں چٹخاتے ہوئے

مسٹر ٹال مٹول

سیما شکیب

یہ ہیں مسٹر ٹال مٹول
کردو ان کا ڈبا گول

ابو کام بتاتے ہیں ان کو غش آجاتے ہیں
کھانے سے انکار نہیں پیٹ بنا رکھا ہے ڈھول
یہ ہیں مسٹر ٹال مٹول
کردو ان کا ڈبا گول

کپڑے میلے رہتے ہیں منھ دھونے سے ڈرتے ہیں
اونچا نیچا پاجامہ کرتے کی کلیوں میں جھول
یہ ہیں مسٹر ٹال مٹول
کردو ان کا ڈبا گول

سب سے لڑتے رہتے ہیں خوب جھگڑتے رہتے ہیں
کڑوی ہے بولی ان کی کبھی نہ بولیں میٹھا بول
یہ ہیں مسٹر ٹال مٹول
کردو ان کا ڈبا گول

ڈانٹ سدا یہ کھاتے ہیں اپنا وقت گنواتے ہیں
آج نتیجہ آئے گا کھل جائے گا ان کا پول
یہ ہیں مسٹر ٹال مٹول
کردو ان کا ڈبا گول

توبہ

مشتاق اعظمی

دہلی کی تاریخی اہمیت سے کون واقف نہیں۔ اسے دیکھنے کی خواہش میرے دل میں برسوں سے مچل رہی تھی۔ دادا جان دہلی میں رہتے تھے۔ وہ بھی ابا جان کو کئی بار لکھ چکے تھے کہ اس بار گرمیوں کی چھٹیوں میں مشتاق کو میرے پاس دہلی ضرور بھیج دینا۔ میری بار بار کی ضد اور دادا جان کی خواہش رنگ لائی اور ابا جان نے مجھے گرمیاں گزارنے کے لیے دہلی بھیج دیا۔ دہلی کی سیر کرنے میں بڑا مزہ آیا۔ میں نے اپنے نئے دوستوں کے ساتھ خوب تفریح کی۔ وہاں مجھے جو دوست ملے، ان میں جمال، ریاض، انور اور پرویز مجھ سے بہت گھل مل گئے، جیسے برسوں کی دوستی ہو۔ روز نیا پروگرام بنتا تھا۔ کبھی لال قلعہ جانے کا، کبھی قطب مینار اور کبھی نظام الدین اولیا۔

ان دوستوں میں سے پرویز کی وجہ سے میں سخت الجھن کا شکار تھا۔ وہ نہ جانے کیوں ہر وقت اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے رہتا تھا اور اسے کسی کے سامنے اپنی آنکھوں سے جدا نہیں کرتا تھا۔ میں نے یہ بات پرویز سے پوچھنی مناسب نہ سمجھی اور دوسرے دوستوں سے معلوم کرنا چاہا، مگر کوئی بھی مجھے تشفی بخش جواب نہ دے سکا۔

ایک دن ہم نے مغل گارڈن کی سیر کا پروگرام بنایا۔ فیصلہ ہوا کہ کل صبح سات بجے تمام ساتھی میرے گھر پہنچ جائیں گے اور پھر وہاں سے تقریباً ساڑھے سات بجے مغل گارڈن کے لیے روانہ ہوں گے۔

دوسرے دن ٹھیک سات بجے پرویز میری قیام گاہ پر پہنچا۔ ریاض، جمال اور انور کے آنے میں کچھ دیر تھی۔ میں اپنے کمرے میں پرویز سے گپ شپ کرنے لگا۔ باتوں

کے درمیان پرویز کو چھینک آئی اور اس کا چشمہ اپنی جگہ سے کھسک کر نیچے آ گیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب میں نے دیکھا کہ پرویز کی ایک آنکھ غائب ہے، صرف دونوں پپوٹے لپٹے ہوئے ہیں۔ موقع غنیمت جان کر میں نے کہا: ''بھائی پرویز! اگر ناگوار نہ ہو تو ایک بات پوچھوں؟''

پرویز نے اجازت دے دی تو اس کی ایک آنکھ ضائع ہونے کا سبب پوچھا۔ پرویز نے ایک سرد آہ بھری اور کہا: ''دوست! میری زندگی کی یہ ایک ایسی کہانی ہے، جو میں کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ چوں کہ یہ واقعہ میرے وطن الٰہ آباد میں پیش آیا تھا، اس لیے یہاں دہلی کے لوگ اس کے بارے میں بالکل ناآشنا ہیں اور اگر کوئی پوچھتا بھی ہے تو میں اسے ٹال دیتا ہوں، کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ یہ واقعہ دہرا کر اپنی کھوئی ہوئی آنکھ کی تکلیف تازہ کروں، مگر تم پوچھ رہے ہو تو سناتا ہوں۔

یہ اس وقت کا ذکر ہے، جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرا معمول تھا کہ میں اکثر اسکول سے آنے کے بعد غلیل لے کر چڑیوں کے شکار کو چلا جاتا تھا۔ مجھے اس کے لیے سخت باتیں سننی پڑتی اور سزائیں بھی ملتی تھیں، مگر میں اپنی عادت سے مجبور تھا۔ چوری چھپے کسی نہ کسی بہانے سے پرندوں کو ستایا کرتا تھا۔ ایک دن ابا جان گھر پر موجود نہ تھے۔ میں نے اپنی غلیل لی اور سیدھا باغ کی طرف روانہ ہوا۔

امی جان نے کہا: ''بیٹا! دیکھو، یہ زمانہ پرندوں کے انڈے بچے دینے کا ہے۔ کم از کم اس موسم میں تو انھیں چین سے رہنے دو۔''

میں نے کہا: ''آپ تو نہ جانے کیوں میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ جس جانور کو خدا تعالیٰ نے حلال بنایا ہے، اس کا شکار کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔''

اس کے بعد میں باغ کی طرف چل پڑا۔ راستے میں میری نظر ایک عمارت کی منڈیر پر پڑی۔ ایک مینا بہت اچھے موقع سے بیٹھی ہوئی تھی۔ بس پھر کیا تھا، میں نے پتھر کا غلہ اُٹھایا اور نشانہ تاک کر جھٹ غلیل چلا دی، لیکن......'' اتنا کہنے کے بعد پرویز ہچکچانے لگا اور اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

میں نے اسے سہارا دیتے ہوئے پوچھا: ''ہاں، پھر کیا ہوا؟''

پرویز نے دکھ بھرے لہجے میں کہا: ''ہوا یہ کہ غلہ لگنے سے پہلے ہی مینا اُڑ گئی اور پتھر کا غلہ عمارت کی منڈیر پر سے ٹکرا کر واپس آیا تو میری داہنی آنکھ میں لگا۔ میں وہیں چکرا کر گر گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، مجھے معلوم نہیں۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک اسپتال میں پایا۔ میری داہنی آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور ابا جان قریب ہی افسردہ بیٹھے ہوئے تھے۔ تقریباً ایک ماہ اسپتال میں گزارنے کے بعد مجھے فرصت ہوئی تو معلوم ہوا کہ میری داہنی آنکھ ضائع ہو چکی ہے۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا، جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ ظلم اور نافرمانی کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔ اب زندگی بھر کے لیے ایک عیب نمایاں ہو چکا تھا اور مجھے اپنا یہ عیب چھپانے کے لیے سیاہ چشمے کا استعمال کرنا پڑا۔ اس حادثے کے بعد میں نے پرندوں کو ستانے اور والدین کی نافرمانیوں سے توبہ کرلی، مگر یہ توبہ میری بینائی واپس نہ لا سکی۔''

پرویز نے جیسے ہی یہ واقعہ ختم کیا ویسے ہی ریاض، جمال اور انور کمرے میں داخل ہوئے اور کچھ دیر بعد ہم لوگ گارڈن دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ ☆

گھر کا پتا

بعض نونہال اپنے خط میں اپنے اسکول یا اپنے والد کی دکان یا دفتر کا پتا لکھتے ہیں۔ اگر گھر کا پتا صحیح نہ ہو تو مجبوری ہے۔ ورنہ گھر کا پتا لکھنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ اسکول اور دکان کا پتا تو بدل بھی جاتا ہے۔

مسکراتی لکیریں

"تم نے ڈاکٹر صاحب کی گھڑی کیوں چرائی؟ انھوں نے تو تم کو دوا بھی مفت دی ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ دوا چار گھنٹے کے وقفے سے کھانی ہے اور میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔"

☆

چوتھا چور

میرزا ادیب

وہ چاروں چور تھے۔ تین تو پُرانے اور خاندانی چور تھے، مگر چوتھے چور کا تعلق
ب شریف خاندان سے تھا۔ بچپن میں بُرے لوگوں کی صحبت میں جا پھنسا اور اس کے نتیجے
ں چور بن کر چوروں کے گروہ میں شامل ہوگیا تھا۔ اُن کا ٹھکانا شہر سے دور ایک ایسے
رانے میں تھا، جہاں کوئی بھی آنا جانا نہیں تھا۔ یہ چور جو کچھ چوری کر کے لاتے تھے،
ے ایک غار میں چھپا دیتے تھے۔ اچھے سے اچھا کھاتے تھے اور اچھے سے اچھا پہنتے تھے۔
ب بھی اچھے لباس میں ملبوس ہو کر شہر میں جاتے تھے تو کوئی شخص بھی انھیں دیکھ کر یہ نہیں
ر سکتا تھا کہ یہ چور ہیں۔

اُن میں سے ایک چور اُن کا سردار تھا، جو چوری کے معاملے میں بڑا تجربے کار
ا۔ وہ انھیں چوری کے نئے نئے طریقے سکھایا کرتا تھا۔ تینوں چور اپنے سردار کی دل و جان
ے عزت کرتے تھے اور اس کی ہر ہدایت پر پورا عمل کرتے تھے۔

ایک رات سردار نے کہا: ''دیکھو! آج ہم چاروں بڑی ہنر مندی سے چوری

کریں گے اور ہم میں سے ہر ایک چوری کر کے جو کچھ لائے گا، وہ اسی کو دے دیا جا
گا۔ وہ اس کا تنہا مالک ہوگا۔ جس طرح چاہے گا، اُسے خرچ کرے گا۔''

اپنے سردار کے منھ سے یہ بات سن کر سب بہت خوش ہوئے اور انھوں نے
کرلیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ مال چوری کر کے لائیں گے، کیوں کہ اس مال کے وہ
مالک ہوں گے۔ سردار اُن سے ہرگز نہیں لے گا، چناں چہ وہ چاروں روانہ ہوگئے۔

صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ چاروں کے چاروں اپنے ٹھکانے پ
ہوگئے۔ سردار نے کہا: ''لاؤ بھئی، دکھاؤ کہ کیا لائے ہو؟ تم جو کچھ لائے ہو، وہ تمھارا مال ہے
پہلے چور نے سونے کے زیورات دکھائے۔ سردار خوش ہوگیا۔ دوسرے
بڑی قیمتی چیزیں دکھائیں۔ سردار نے اس پر بھی خوشی کا اظہار کیا اور پیار سے اس کے
ہاتھ پھیرا اور اسے شاباشی دی۔ اب باری تھی تیسرے چور کی۔ وہ اب تک بالکل خام
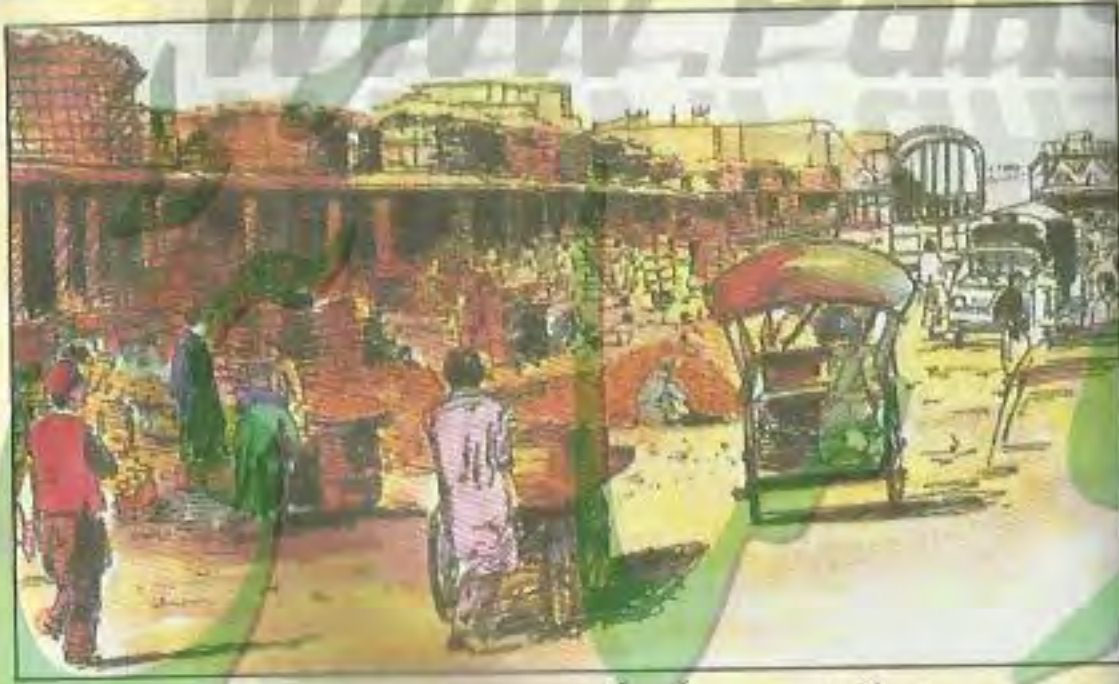
بیٹھا تھا۔ سردار اُس کی طرف بار بار کن انکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا اور باتیں دوسروں سے
کرتا جاتا تھا۔

''ساقی! اب تمھاری باری ہے۔''

اس چوتھے چور کا نام ساقی تھا اور اس کے ساتھی اور سردار اسی نام سے اُسے
پکارتے تھے۔

ساقی دو تین لمحے خاموش رہا، پھر بولا: ''سردار! اس سے پہلے کہ میں ہاں یا نہ
میں جواب دوں، میں وہ واقعہ سنانا چاہتا ہوں، جو میرے ساتھ پیش آیا۔''

''ضرور سناؤ۔'' سردار نے کہا۔

''سردار! میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ صرف ایک ہی گھر میں نہیں جاؤں گا، دو تین گھروں
میں جاؤں گا اور زیادہ سے زیادہ مال اُٹھاؤں گا، مگر پہلے ہی گھر میں یہ واقعہ پیش آگیا۔''

''کون سا واقعہ؟''

''میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھی اور کمزور عورت چارپائی پر پڑی ہے اور درد

سے کراہ رہی ہے۔ اُس کے پاس زمین پر اُس کی بیٹی سو رہی ہے۔ گھر کے سامان سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بڑا غریب خاندان ہے، بیمار عورت کا ٹھیک سے علاج بھی نہیں ہو رہا۔ یہاں کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی مل سکتا تھا اور بڑی آسانی سے، مگر میرا دل بے قرار ہو گیا۔ میں نے سوچا: ساقی! تُو ایک ایسے گھر کو لوٹنا چاہتا ہے، جس میں کچھ ہے ہی نہیں اور سردار! میری جیب میں جتنی رقم تھی، وہ میں نے اس لڑکی کے تکیے کے نیچے رکھ دی، تا کہ اس کی ماں کا

علاج ہو سکے اور باہر نکل آیا۔''

''پھر؟''

''اس کے بعد مجھ سے اندر کسی اور گھر میں جانے کی ہمت ہی نہ آئی۔ اصل میں اس واقعے نے مجھ پر بڑا اثر کیا۔ میں اِدھر اُدھر گھوم کر وقت گزارتا رہا اور صبح کے دھندلکے میں یہاں آ گیا۔''
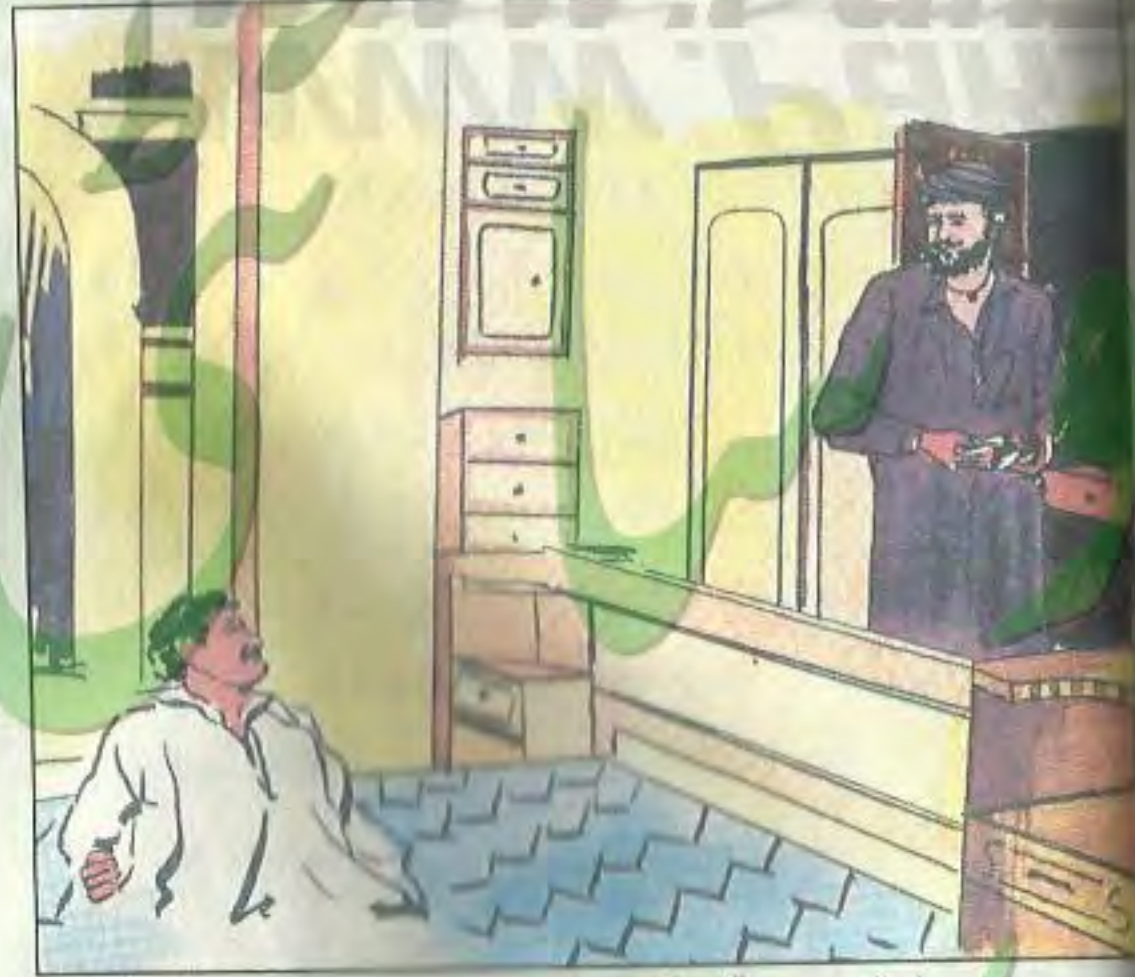
سردار نے حقارت سے قہقہہ لگایا۔

''ارے! تیرے سینے میں تو چوہے کا دل ہے۔ تُو سخت بُزدل آدمی ہے۔ کیوں ساتھیو! میں صحیح کہہ رہا ہوں یا غلط؟''

باقی دونوں چوروں نے بھی اپنے سردار کی طرح حقارت آمیز قہقہے لگائے اور کہا: ''سردار! تُو نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ یہ چور ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر چور کے دل میں رحم آ جائے تو وہ چوری کر ہی نہیں سکتا۔''

''تو کیا یہ بُزدل اور نکما آدمی ہمارے گروہ میں شامل رہ سکتا ہے؟''

''ہرگز نہیں۔'' دونوں نے پُر زور لہجے میں کہا۔

سردار سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ ساقی نے اُس کی طرف دیکھا اور سمجھ لیا کہ وہ سوچ رہا ہے۔ کہنے لگا: ''سردار! میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کروں گا جس سے میرے پُرانے ساتھیوں کو کوئی تکلیف ہو۔ میں کسی کو آپ لوگوں کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔''

سردار گرجا: ''یاد رکھ! اگر تُو نے کوئی ایسی حرکت کی تو ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا، لیکن تجھے ہم کسی صورت میں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''بے شک، بے شک۔'' دونوں چوروں نے اپنے سردار کی تائید کی۔

سردار نے ساقی کو اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھا کر یہ عہد کرنے کو کہا کہ وہ کبھی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گا اور ساقی نے یہ قسم کھائی۔ سردار جانتا تھا کہ ساقی کو اپنی ماں سے بڑا پیار تھا اور جب کبھی وہ اُسے یاد کرتا تو اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے تھے۔

ساقی ویرانے سے نکل آیا۔ اس ارادے کے ساتھ کہ وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا اور اپنے پُرانے ساتھیوں سے کسی قسم کا بھی تعلق قائم نہیں کرے گا اور نہ کسی کو اُن کے بارے میں کچھ بتائے گا۔ ویرانے سے نکلتے وقت وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ اُسے زندگی بسر کرنے کا کوئی طریقہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کہاں جائے، کیا کرے، کس طرح روٹی کمائے؟ یہ سوال اُسے پریشان کر رہا تھا۔

صبح ہوگئی اور وہ چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ سبزی منڈی پہنچ گیا۔ مختلف علاقوں میں سبزی بیچنے والے یہیں سے سبزی خریدتے ہیں۔ ساقی نے دیکھا کہ کافی مزدور سبزیاں اُٹھا اُٹھا کر دکان داروں کے ساتھ جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ یہ سبزیاں تانگوں اور ریڑھیوں میں رکھ رہے ہیں۔ بے آسرا، بے سہارا تو وہ تھا ہی، اُس نے جب ایک دکان دار کو آڑھتی کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا: ''جناب! میں مزدوری کر سکتا ہوں؟''

دکان دار نے کبھی کسی مزدور کو اس تہذیب سے سوال کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ساقی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا: ''پہلی بار منڈی میں کام کرنے آئے ہو؟''

''جی جناب!''

''بہتر، جو سبزیاں خریدوں، میرے تانگے میں رکھتے جاؤ۔''

''اچھا جناب!''

ساقی صحت مند تھا۔ بوجھ اُٹھاتے ہوئے اُسے کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اُس نے ساری سبزیاں دیکھتے ہی دیکھتے تانگے میں رکھ دی۔

''تمھارا نام کیا ہے؟''

''ساقی! جناب!''

''تانگے میں بیٹھ جاؤ۔''

ساقی اس کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا۔ راستے میں اُس نے دکان دار کو بتایا کہ وہ بے کار ہے۔ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ کام کر کے حق حلال کی روزی کمانا چاہتا ہے۔

دکان دار نے اُس سے کہا: ''اگر تم واقعی حق حلال کی کمائی چاہتے ہو تو روز میرا کام کر دیا کرو۔ میں مزدور کو مزدوری دینے میں کبھی کنجوسی نہیں کرتا۔''

ساقی نے اُسے بتایا کہ وہ اپنے رشتے داروں کو چھوڑ چکا ہے اور اب رہنے کا کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ اس شخص نے اُسے اپنے ہاں رہنے کی اجازت دے دی۔ ساقی محنت اور دیانت داری سے کام کرنے لگا۔ مالک نے جب دیکھا کہ وہ ہر کام بڑے شوق سے کرتا ہے تو اس سے کہا: ''سبزیاں تانگے پر لادنے کے بجائے تم میری ایک دکان پر بیٹھ کر سودا بیچا کرو۔''

ساقی اب دکان پر بیٹھتا تھا اور ایمان داری سے اپنے فرائض ادا کرتا تھا۔ دکان داری کرتے ہوئے اُسے کئی سال بیت گئے۔ اس عرصے میں اُس نے خاصی رقم

بچالی۔ اس رقم سے اُس نے آڑھت کا کام شروع کر دیا۔ یہ کام برابر بڑھتا گیا اور آ[illegible] سال کے بعد وہ منڈی کا سب سے بڑا آڑھتی بن گیا۔

دولت اس کی طرف کھنچی چلی آ رہی تھی۔ اس نے کرائے کا مکان چھوڑ کر ایک اچھا اور بڑا مکان خرید لیا۔ شادی کر لی اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارنے لگا۔ اس نے چوروں کے سردار سے جو وعدہ کیا تھا، اُسے پورا کیا۔ کبھی کسی سے اُس گروہ کے متعلق کوئی بات نہ کی۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے کسی قدر دور اپنے کمرے میں ایک سائے کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا اور اُسے پہچان لیا۔ وہ اپنے پلنگ سے اُٹھ بیٹھا۔

''ٹھیرو!'' اُس نے قریب ایک سائے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سایہ رک گیا۔ ساقی دوسرے کمرے میں گیا اور بیوی کے سارے زیور لا کر ایک ڈھیر کر دیے: ''یہ لے جاؤ۔'' سایہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

''سردار! یہ زیورات لے جاؤ، اسی لیے تو تم یہاں آئے ہو۔''

''تم؟''

''میں ساقی ہوں۔ پہچانا مجھے سردار!''

''تم ساقی ہو؟''

''جی ہاں سردار! کیا مجھے اتنا تجربہ نہیں ہے کہ چور کے دبے پاؤں کی آہٹ سن سکوں۔ میرے گھر میں سب سے قیمتی چیز یہی ہے، جو میں تمھیں دے رہا ہوں اور خوشی سے دے رہا ہوں۔ صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں؟''

''پوچھو۔''

''سردار! تم نے مجھے بے عزت کر کے نکال دیا تھا، کیوں کہ میں آخری دن کچھ بھی چُرا کر نہیں لایا تھا اور تم سب بہت کچھ لائے تھے، مگر آج میں تمھیں ہزاروں روپے کے زیورات دے رہا ہوں اور تم میرے محتاج ہو کر آئے ہو۔ تم آج بھی چوری کر کے زندہ رہنے پر مجبور ہو اور میں خوش حال ہوں، یہ کیوں؟ میں اس کا جواب تم سے پوچھ رہا ہوں۔''

سردار خاموش کھڑا رہا اور پھر کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

اب ساقی کی بیوی بھی جاگ کر وہاں آ گئی تھی۔ اس نے جو اندھیرے میں چمکتی ہوئی چیزیں دیکھیں تو فوراً اُدھر لپکی، زیورات دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''میرے زیورات!''

''ہاں۔''

''کیا کوئی چور لے جا رہا تھا؟''

''لے کر گیا نہیں۔''

ساقی کی بیوی نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس کے شوہر نے چور کو زیورات نہیں لے جانے دیے۔

صبح کے وقت ساقی منڈی میں چلا گیا۔ ابھی اُسے وہاں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک آواز آئی: ''مزدور کو کام مل سکے گا؟''

اس نے سامنے دیکھا تو سردار کھڑا تھا۔

''سردار! تم؟''

''آج سے سردار نہیں، صرف ایک مزدور، نہ صرف میں بلکہ تمھارے دو پُرانے ساتھی بھی۔ وہ اُدھر کھڑے ہیں۔''

ساقی نے سب کو باری باری اپنے سینے سے لگا لیا اور اُس روز سے اُن تینوں نے بھی نیک زندگی گزارنی شروع کر دی۔

☆

بلاعنوان انعامی کہانی

رئیس فاطمہ

بہت دنوں کی بات ہے کسی ملک پر ایک بادشاہ کی حکومت تھی، جس کی تین بیٹیاں تھیں۔ دونوں بڑی بیٹیاں بہت خوب صورت تھیں، لیکن چھوٹی شہزادی جس کا نام گل رُخ تھا، شکل صورت میں اپنی دونوں بڑی بہنوں سے کم تھی، لیکن باقی دوسرے کاموں میں وہ ان سے زیادہ ہوشیار تھی۔ وہ نیزہ بازی میں ماہر تھی، تلوار اچھی طرح چلاتی تھی، گھڑسواری کی ماہر تھی، اس کی آواز بہت اچھی تھی، کبھی کبھی کسی جشن کے موقع پر وہ ملکہ کے کہنے سے گا بھی لیتی تھی۔ تینوں بہنوں کی تعلیم و تربیت بہت اعلا طریقے سے ہوئی تھی۔ شہزادی گل رُخ کو بچپن ہی سے گڑیوں سے کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ اس کے پاس بہت سی گڑیاں تھیں۔ ایک دفعہ بادشاہ کسی دوسرے ملک گھومنے گئے۔ وہاں سے واپسی پر انھوں نے اپنی بیٹیوں کے لیے بہت سے تحفے لیے، جیسے ہی انھوں نے جہاز پر قدم رکھنا چاہا کہ ایک آواز نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ کوئی کہہ رہا تھا: ''طلسماتی گڑیاں...... چُن مُن گڑیاں ...... ہے کوئی سخی داتا، جو ان کو خرید سکے۔''

بادشاہ نے چونک کر اس شخص کو دیکھا، جس کے ہاتھوں میں لال رنگ کا ایک بڑا سا ڈبا تھا۔ بادشاہ نے اس شخص کو بلوایا اور پوچھا کہ ان گڑیوں میں کیا خاص بات ہے؟

بوڑھے نے جھک کر بادشاہ کو سلام کیا اور ادب سے بولا: ''حضور! یہ گڑیاں ناچتی اور گاتی ہیں، لیکن صرف رات کو۔ دوسری خوبی ان کی یہ ہے کہ یہ جس کی ملکیت ہوں گی، مصیبت میں اس کی مدد کریں گی۔''

بادشاہ نے ان کی قیمت پوچھی تو وہ شخص بولا: ''پانچ اشرفیاں، صرف شہزادی گل رُخ کے لیے۔''

بادشاہ کو جھٹکا سا لگا۔ اس شخص کو کیسے معلوم ہوا کہ میری بیٹی کا نام گل رخ ہے اور وہ گڑیوں کی شوقین ہے۔ بہر حال اس نے گڑیاں خرید لیں اور جب وہ اسے پانچ اشرفیاں دے رہا تھا تو اس بوڑھے نے جس کی لمبی سی داڑھی اور سر پر ترکی ٹوپی تھی، بادشاہ کو گڑیوں کا صندوقچہ دیتے ہوئے کہا: ''حضور! ایک بات کا خیال رکھیے گا۔ شہزادی صاحبہ سے کہیے گا کہ جب بھی کہیں باہر جائیں، گڑیوں کا صندوقچہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں۔ اگر کبھی وہ کسی مشکل میں گرفتار ہوئیں تو یہ گڑیاں ان کی مدد کریں گی۔''

اتنا کہہ کر وہ شخص لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا واپس چلا گیا۔ بادشاہ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ روحانی علوم کا ایک ماہر ہے اور گڑیاں بنا کر بیچتا ہے۔ یہی اس کا روزگار ہے۔

بادشاہ جب اپنے وطن پہنچا تو اس نے گڑیوں کا صندوقچہ شہزادی گل رخ کو دیا اور وہ سب باتیں بھی بتا دیں، جو اس اجنبی شخص نے کہی تھیں۔ رات کو شہزادی نے اپنی بہنوں ملکہ اور بادشاہ کے سامنے گڑیوں کا پٹارا کھولا تو وہ اندر سے روشن ہو گیا اور گڑیاں باہر نکل کر آ گئیں۔ یہ گڑیاں ننھی منی عورتیں لگ رہی تھیں۔ انھوں نے باہر نکل کر صندوقچے میں سے ایک مناسب سا تخت نکالا۔ تخت پر وہ گڑیا بیٹھ گئی، جس کے سر پر سنہری تاج تھا۔ وہ بہت سا زیور اور قیمتی لباس بھی پہنے ہوئے تھی۔ دو گڑیاں جو سرخ اور سبز لباس پہنے تھیں، وہ تخت والی گڑیا کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ باقی چار گڑیوں نے بھی دھانی پشواز، سبز پاجامے اور آتشی گلابی دوپٹا اوڑھے ہوئے تھیں، جس پر سنہرے گوٹے اور زرتار کلابتو سے بہت ہی خوب صورت کام بنا ہوا تھا، وہ رقص پیش کرنے لگیں۔ کچھ دیر یہ سلسلہ جاری رہا، پھر تمام گڑیاں ایک ایک کر کے اپنے پٹارے میں چلی گئیں۔ شہزادی گل رخ اور اس کی بہنوں کو یہ تماشا بہت پسند آیا۔ بادشاہ سلامت اور ان کی بیگم بھی اس رقص و سرور سے بہت محظوظ

ہوئے۔ شہزادی اس صندوقچے کو ہمیشہ اپنے سرہانے رکھ کر سوتی اور جہاں بھی جاتی، وہ صندوقچہ خفیہ طور پر اس کے ساتھ ہوتا۔

ایک دفعہ رات کو سوتے سوتے شہزادی کو ایسا لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہے: ''وزیر دھوکے باز ہے۔''

یہ جملہ تکرار کے ساتھ اسے سنائی دے رہا تھا۔ اس نے قریب سوئی ہوئی خادمہ کو دیکھا تو وہ بے خبر سو رہی تھی، شمع دان کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ اٹھی تو دیکھا کہ گڑیوں کے پٹارے میں روشنی ہو رہی ہے اور آواز بھی وہیں سے آ رہی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ طلسمی گڑیاں ہیں۔ اس نے صندوقچے کے قریب منھ لے جا کر کہا: ''ٹھیک ہے میری چُن مُن گُڑیو! میں صبح یہ بات ابا حضور کو ضرور بتاؤں گی۔ تمھارا بہت بہت شکریہ۔''

پٹارے میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ صبح سویرے جب بادشاہ سلامت نماز پڑھ کر اُٹھے تو شہزادی نے انھیں رازداری سے رات والی بات بتائی۔ بادشاہ یہ سن کر حیران رہ گئے، کیوں کہ بظاہر وزیر ہر وقت بادشاہ پر جان دینے کو تیار رہتا تھا۔ بادشاہ نے فوراً دیوان حافظ نکالا اور جانماز پر قبلہ رو ہو کر فال نکالی تو یہ شعر سامنے آیا، جس کا مطلب یہ تھا: ''اہلِ بشارت وہ ہے، جو اشارہ سمجھے، نکتوں پر غور کرے، ورنہ اشارے اور نکتے اور بھی ہیں۔''

بادشاہ نے صبح ہوتے ہی نہایت قابل اور بااعتماد ساتھیوں کو وزیر کی جاسوسی پر لگا دیا۔ چند دنوں بعد وہ سب ایک ہی خبر لائے کہ وزیر پڑوسی ملک کے بادشاہ سلامت سے ملا ہوا ہے۔ وہ یہاں کے راز وہاں پہنچاتا ہے۔ پڑوسی بادشاہ چند دن بعد ملک، پر حملہ کر کے بادشاہ سلامت کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، جس کے بعد وزیر کی شادی اپنی بیٹی سے کر دے گا اور بدلے میں وزیر کو بادشاہ بنا دے گا۔ بادشاہ نے مزید تحقیق کی اور جب اسے ثبوت مل گئے تو اس نے وزیر کو غداری کے جرم میں سرِعام پھانسی دلوا دی۔ اس واقعے کے بعد شہزادی اور بھی زیادہ چُن مُن گُڑیوں کی حفاظت کرنے لگی۔

ایک دن موسم بہت اچھا تھا اور بادشاہ اپنے ساتھیوں اور ملازموں کے ساتھ شکار کے لیے جا رہا تھا۔ حسبِ معمول مردانہ لباس میں شہزادی گل رخ بھی باپ کے ساتھ تھی اور ہمیشہ کی طرح اس کی کنیزِ خاص زمرد بھی اس کے ہمراہ تھی، جو بہت خوب صورت تھی۔ شکار گاہ میں شکار کھیلتے ہوئے اچانک شہزادی کو یاد آیا کہ وہ آج جلدی میں چُن مُن گُڑیوں کا صندوقچہ لینا بھول گئی۔ اسے شدید پریشانی نے آ گھیرا، کیوں کہ اُن کے طلسم کا راز صرف شہزادی اور اس کے گھر والوں کے علاوہ کسی کو نہ تھا۔ شہزادی ہمیشہ وہ صندوقچہ اپنے سامان میں رکھتی تھی۔ اسی دوران شہزادی کو ایک ہرن کا بچہ نظر آیا، جو بہت ہی خوب صورت تھا، خصوصاً اس کی آنکھیں بہت حسین تھیں۔ شہزادی نے اسے دیکھ کر اپنا گھوڑا اس کے پیچھے ڈال دیا۔ زمرد نے بھی شہزادی کا ساتھ دیا۔ دونوں گھوڑوں پر اس کا پیچھا کرتی ہوئی دور تک چلی گئیں۔ اچانک وہ ہرن کا بچہ ایک حویلی میں داخل ہو گیا، جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شہزادی کو ویرانے میں حویلی دیکھ کر تعجب ہوا، لیکن وہ جلدی سے خود بھی گھوڑے سے اُتری اور اپنی کنیز کو بھی اُتار لیا اور دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر حویلی میں داخل ہو گئیں، لیکن ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ انھوں نے پہلے ہر جگہ ہرن کو تلاش کیا، لیکن جب وہ کہیں نہ ملا تو واپسی کے لیے مڑیں، لیکن دروازہ کسی طرح سے نہ کھلا۔ وہ تھک گئیں اور پھر اٹھ کر حویلی کا جائزہ لینے لگیں۔ حویلی بہت صاف ستھری تھی، لیکن کوئی شخص وہاں نظر نہ آیا۔ تب انھوں نے ایک ایک کمرا دوبارہ دیکھنا شروع کیا۔ ایک کمرے کا دروازہ انھیں بند ملا۔ کنیز نے اسے دھکا دیا تو وہ کھل گیا۔ اندر ایک شان دار مسہری پر ایک بہت خوب صورت اور پُرکشش شخص سو رہا تھا، جس کے تمام بدن میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں، حتیٰ کہ آنکھوں، ناک، ہونٹ، کان اور ماتھے پر بھی سوئیاں ا...

سوئیاں تھیں۔ جسم کا کوئی حصہ سوئیوں سے خالی نہ تھا۔ دونوں اسے دیکھ کے ڈر گئیں، پھر آوازیں دیں، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا، پھر شہزادی نے اس کے دل پہ کان لگا کر دیکھا تو دھڑکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ زندہ تھا، شاید کسی نے اسے سوئیاں چبھو کر بے ہوش کر دیا تھا۔ دونوں کمرے سے نکل آئیں۔ اُن کے گھوڑے باہر ہی رہ گئے تھے۔ ان کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہ تھا۔ دونوں نے اُٹھ کر باورچی خانہ ڈھونڈا اور اس میں جا کر دیکھا تو بہت سا خشک اناج ملا۔ لکڑیاں بھی تھیں اور کوئلا بھی۔ دونوں نے کسی نہ کسی طرح چولھا جلایا، روٹی پکا کر پیٹ کی آگ بجھائی۔ اس عرصے میں بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کو دونوں گھوڑے حویلی کے باہر نظر آ گئے۔ انھوں نے دروازہ پیٹنا شروع کیا تو اندر سے شہزادی نے بتایا کہ وہ کسی آسیب زدہ جگہ پھنس گئی ہیں، پھر انھوں نے ایک جھروکا تلاش کیا اور بادشاہ کو تمام صورت حال بتائی اور کہا کہ وہ واپس جا کر اس کی رہائی کی کوئی تدبیر کریں۔ بادشاہ نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے کھانے پینے کا سامان جھروکوں سے اندر پہنچایا اور غمزدہ وہاں سے چلا گیا، لیکن اگلے دن جب بادشاہ کے ملازم وہاں دوبارہ حال معلوم کرنے گئے تو وہ راستہ بھول گئے اور ہزار کوششوں کے باوجود بھی انھیں نہ حویلی ملی، نہ اس کا کوئی نشان۔

اُدھر شہزادی نے سوچا کہ وہ اس شخص کی سوئیاں نکالنے کی کوشش کرے، کیوں کہ وہ ابھی زندہ ہے، لہٰذا اس نے اس شخص کے جسم سے سوئیاں نکالنی شروع کیں اور ان سوئیوں کو ایک چھوٹے سے ڈبے میں جمع کرتی گئی۔ تین دن میں اس نے تمام سوئیاں نکال دیں۔ اب صرف آنکھوں کی سوئیاں باقی تھیں۔ چوتھے دن شہزادی نے کنیز سے کہا کہ وہ ابھی نہا کر آتی ہے، اتنے میں وہ کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرے۔ یہ کہہ کر وہ نہانے چلی گئی۔ اُدھر کنیز کے دل میں بے ایمانی آئی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ آنکھوں کی سوئیاں نکال کر دیکھے کہ کیا ہوتا ہے؟ سو اس نے شہزادی کی بات کو نظر انداز کر کے سوئے ہوئے آدمی کی آنکھوں کی

سوئیاں نکال دیں، وہ اس طرح اُٹھ بیٹھا، جیسے طویل نیند سے جاگا ہو۔ اس نے بیدار ہوتے ہی چاروں طرف نظر ڈالی اور کنیز سے پوچھا: ''تم کون ہو؟ اور یہاں کیسے آ گئیں؟''

کنیز کو شہزادی بننے کا موقع مل رہا تھا۔ اس کی نیت میں شروع سے ہی کھوٹ تھا۔ لہٰذا اس نے خود کو شہزادی گل رُخ بتا کر اس کے جسم سے سوئیاں نکالنے کی بات بتائی اور سوئیوں سے بھرا ڈبا اسے دکھا کر کہا کہ اس کی ملازمہ کنیز بھی اس کے ساتھ ہے، جو نہانے گئی ہے۔ نیز یہ کہ اس کے جسم کی سوئیاں خود اُس نے نکالی ہیں۔ یہ سن کر اس شخص نے بتایا کہ وہ ایک ملک کا شہزادہ ہے۔ ایک جادوگر نے دشمنی میں آ کر اسے محل سے اُٹھایا اور یہاں لا کر قید کر دیا اور کہا کہ جب تک اس طلسماتی حویلی میں کوئی انسان داخل نہیں ہوگا، تم یوں ہی قیامت تک سوتا رہے گا۔''

ابھی وہ دونوں باتیں ہی کر رہے تھے کہ شہزادی نہا کر آ گئی۔ اس نے جو شہزادے کو جاگتے دیکھا تو ہڑبڑا کر بولی: ''صرف آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی تھیں۔''

کنیز زمرد رعب سے بولی: ''ہاں، صرف آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی تھیں، وہ بھی میں نے نکال دیں۔ جاؤ، جا کر میرے اور شہزادے کے لیے کچھ کھانے کو لاؤ۔''

شہزادی سمجھ گئی کہ پانسہ پلٹ چکا ہے، لہٰذا اس نے مصلحتاً خاموشی اختیار کی کہ اگر وہ خود کو شہزادی بتاتی اور شہزادہ یقین نہ کرتا تو کنیز اسے قید بھی کر سکتی تھی۔ شہزادے کا نام دانیال تھا۔ کنیز چوں کہ دیکھنے میں شہزادی سے زیادہ خوب صورت تھی، اس لیے شہزادے نے سمجھا کہ کنیز ہی اصل شہزادی ہے۔ شہزادی گل رخ نے بڑے بڑے علما سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ مطالعے کی بھی شوقین تھی۔ اس مصیبت میں اسے حضرت علیؓ کا وہ تاریخی جملہ یاد آیا:

''جس پر احسان کرو، اس کے شر سے بچو۔''

اس نے کمرے میں جا کر دو رکعت نماز حاجت پڑھی، اللہ سے دعا کی کہ وہ اسے

اس بُرے وقت میں ثابت قدم رکھے۔ اس نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا اور صبر و شکر اور خاموشی سے دونوں کی خدمت کرنے لگی۔ دوسرے دن شہزادے نے جب حویلی کا دروازہ کھولا تو وہ فوراً کھل گیا۔ جس کا مطلب تھا کہ اب یہ حویلی سحر زدہ نہیں ہے۔ شہزادے کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کو یہاں قید ہوئے کتنا عرصہ گزر گیا۔ بس اس کے پاس تو چند دن کا حساب تھا۔ شہزادی گل رُخ نے ایک دن شہزادے سے پوچھا کہ جب وہ خود کسی جادو کے اثر میں تھا تو یہاں کھانے پینے کا سامان کیسے موجود تھا، مثلاً نمک، مرچ، آٹا، چاول اور دال وغیرہ اور موم شمعیں بھی تھیں؟ شہزادے کو تعجب ہوا کہ شہزادی (نقلی) نے تو یہ سوال نہیں کیا، یہ تو کنیز ہے، اس کے دماغ میں یہ بات کیسے آئی؟

اس نے کہا: ”جس جادوگر نے مجھے یہاں قید کیا تھا، وہ کبھی بادشاہ کا دوست تھا، لیکن بادشاہ کے چھوٹے بھائی نے تخت پہ قبضہ کرنے کے لیے اس جادوگر کو منھ مانگا انعام دیا تھا۔ جب وہ مجھے قید کرنے لایا تو اسے خدا جانے کیوں رحم آیا اور کہنے لگا کہ جب کوئی انسان تجھے ہوش میں لائے گا تو اسے یہاں کچھ کھانے پکانے کا سامان ضرور ملے گا، تا کہ تُو بھوکا نہ رہ سکے۔“

کچھ دن بعد شہزادے نے کنیز زمرد سے کہا: ”میں اپنے وطن جا کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہاں کا کیا حال ہے۔ پھر میں اپنے والد سے اجازت لے کر تم سے شادی کروں گا۔“

یہ کہہ کر وہ سفر کی تیاری کرنے لگا، لیکن روپیہ پیسہ اس کے پاس نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے کنیز جیسے ہی غسل خانے میں گئی، شہزادی نے موقع غنیمت جان کر اس سے کہا: ”حضور! آپ پریشان نہ ہوں، کل علی الصباح آپ یہاں سے چلے جائیں۔ گھر سے باہر نکل کے دس قدم گن کر اُٹھایئے گا۔ وہاں ایک نشانی ہوگی۔ آپ وہاں کی زمین کھودیے گا۔ زادِ راہ مل جائے گا، لیکن شہزادی صاحبہ (کنیز زمرد) سے اس بات کا بالکل ذکر نہ کیجیے گا، ورنہ وہ آپ کے جانے کے بعد مجھے مار ڈالیں گی۔“

اتنا کہہ کر شہزادی واپس باورچی خانے میں آ گئی۔ رات کو شہزادی نے اپنا زیور ایک ...ے میں باندھا اور اسے زمین میں دبا کر وہاں ایک ٹہنی گاڑ دی۔ ٹہنی پہ ایک کپڑا باندھ دیا۔ صبح شہزادہ رخصت ہونے لگا تو کنیز کو شہزادی سمجھ کر پوچھا کہ وہ شہر سے اس کے لیے کیا لائے؟ اس ...ا کہا: ”بہت سے گہنے، کپڑے سونے کی چوڑیاں اور مزے مزے کے کھانے۔“

شہزادے نے نوکرانی یعنی اصلی شہزادی سے پوچھا تو اس نے نہایت ادب سے ...: ”حضور! اگر موقع ملے تو میرے لیے چُن مُن گڑیاں لیتے آیئے گا۔“

صبح شہزادہ جب سفر پر روانہ ہوا تو نشان زدہ جگہ دیکھ کر اس نے زمین کھودی تو ...ں سے ایک تھیلی میں چند زیورات بندھے ملے۔ ساتھ ہی ایک پرچے پہ تحریر تھا: ”چُن مُن گڑیاں صرف اجمیر کے بادشاہ کے پاس ہیں۔ اگر آپ کا اجمیر جانا ہو تو ان سے بلا جھجک گڑیاں طلب کر لیجیے گا۔“

شہزادہ پرچا اور زیور دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس نے دونوں چیزیں حفاظت سے اپنے پاس رکھ لیں اور پیدل چل نکلا۔ سامنے سے ایک بیل گاڑی والا آ رہا تھا۔ اس نے گاڑی بان کو روکا اور اسے کسی قریبی بستی تک پہنچانے کے لیے کہا۔ پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ گاڑی بان کو کرایہ نہیں دے سکتا، البتہ کچھ دن بعد وہ کرایہ ادا کر دے گا۔ گاڑی بان نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا: ”مالک سے فضل سے میرے پاس بہت کچھ ہے۔ تم مسافر لگتے ہو اور پردیسی بھی، آؤ، بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں بستی میں اُتار دوں گا۔“

شہزادہ جب بستی پہنچا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ گاڑی بان نے ایک بھٹیار خانے میں لے جا کر شہزادے کو کھانا کھلایا اور دو روپے زبردستی اس کو خرچ کے لیے دیے۔ شہزادے نے اس کا نام اور پتا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اسی جگہ کا رہنے والا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر کا نام دھرم پور ہے اور اس کا نام نند لال ہے۔ شہزادے نے اپنا نام بتایا اور پوچھا کہ اگر

وہ دوبارہ اس سے ملنا چاہے تو کیسے ملے۔ نند لال بتایا کہ وہ اسی بھٹیار خانے میں آ کر
میں روٹی لگانے والی مائی سے اس کا پتا پوچھ لے، کیوں کہ وہ اس کی ماں ہے۔ جب د
رخصت ہونے لگے تو نند لال نے اپنی ماں سے کہا کہ دانیال اس کا دوست ہے، اگر
رات کو یہاں رکنا چاہے تو اپنے پاس ٹھیرا لینا اور کھانے کے پیسے مت لینا۔ شہزادے
کچھ دیر تو آرام کیا، شام کو اس نے بھٹیارن سے پوچھا کہ دولت آباد کہاں ہے؟ وہ بولی
دولت آباد تو بہت دور ہے۔ پھر اس نے اچانک اجمیر کا پوچھا تو وہ بولی کہ اجمیر تو پا
قریب ہے۔ تم کسی سے گھوڑا کرائے پر لے لو یا چاہو تو بیل گاڑی پہ بھی جا سکتے ہو، ا
گھوڑے پہ تم ایک دن میں پہنچ جاؤ گے، لیکن بیل گاڑی تمھیں دو دن میں پہنچائے گی۔
سن کر دانیال شہر گھومنے نکلا اور ایک سنار کے پاس جا کر شہزادی گل رخ کی دی ہوئی انگو
بیچی، جس میں قیمتی ہیرا لگا ہوا تھا۔ وہاں سے وہ بازار گیا۔ اپنے لیے صاف ستھرا لباس ا
سفر کے لیے ایک گھوڑا خریدا۔ یہ سب لے کر وہ سرائے واپس آیا۔ رات کو وہیں قیام
اور صبح تاروں کی چھاؤں میں اجمیر کی طرف چل پڑا۔ جانے سے پہلے اس نے بھٹیارن
کچھ رقم دی، پھر نند لال کے دور پے بھی واپس کیے۔

اجمیر پہنچتے پہنچتے اسے رات ہو گئی۔ اس نے خواجہ غریب نوازؒ کے مزار کے پاس
ایک سرائے میں قیام کیا۔ صبح اُٹھا، نماز پڑھ کر خواجہ غریب نوازؒ کے مزار پہ گیا۔ وہاں فا
پڑھی اور مقصد میں کام یابی کی دعا مانگی۔ ابھی وہ کیف وجذب کی کیفیت میں ڈوبا دعا ما نگ
ہی رہا تھا کہ اچانک ''ہٹو، بچو'' کی آوازیں آنے لگیں۔ پتا چلا کہ بادشاہ مزار پر حاضری
دینے آیا ہے۔ وہ ایک طرف ہو گیا۔ بادشاہ اکیلا اندر داخل ہوا، اپنی محبت و عقیدت کا
اظہار کیا اور دعا مانگنے لگا۔ شہزادے نے سوچا کہ اس سے اچھا موقع بادشاہ سے ملنے کا
نہیں ملے گا۔ لوگ ایک اجنبی مسافر کو بادشاہ سے نہیں ملنے دیں گے۔ اس نے ایک دم فیصلہ ک

شاہ کے مزار مبارک سے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا، جوں ہی بادشاہ باہر آیا، اس نے چلّا کر
''حضور! عالی جاہ! مجھے چُن مُن گڑیاں چاہییں۔'' بادشاہ نے حیرت سے سر اٹھا کر دانیال کو
اور اپنے قریب بلا کر دوبارہ پوچھا کہ اس نے کیا مانگا تھا؟ شہزادے نے پھر اپنا سوال دہرایا
کا چہرہ دمکنے لگا۔ بادشاہ نے خدام کو حکم دیا کہ اس شخص کو باعزت محل میں لے چلو۔

محل میں پہنچ کر شہزادہ دانیال کی پہلے تو خاطر مدارت کی گئی، پھر بادشاہ نے پوچھا کہ
چُن مُن گڑیاں کیوں چاہییں؟ اس نے ساری داستان سنا دی۔ بادشاہ سلامت سمجھ گئے کہ
خادمہ کی وہ بات کر رہا ہے، دراصل وہی ان کی چہیتی بیٹی گل رُخ ہے۔ بادشاہ نے تشکر آمیز
میں کہا: ''نوجوان! تم میرے لیے مبارک ثابت ہوئے ہو۔ ہم اپنی بیٹی کے لیے دعا مانگنے
تھے، ہماری دعا قبول ہوئی۔ اب تم آرام کرو۔ شام کو ہم چُن مُن گڑیوں کا صندوقچہ تمھاری
کر دیں گے۔ تم جاتے ہی اپنی خادمہ کو دے دینا۔''

بادشاہ نے مصلحتاً یہ نہیں بتایا کہ وہی خادمہ ان کی بیٹی ہے۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں کنیز
وہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچائے، لیکن بادشاہ نے گڑیوں کا صندوقچہ دینے سے پہلے اس سے
خواہش ظاہر کی کہ جو زیورات اسے کنیز کے بتانے پر پوٹلی سے ملے تھے، وہ انھیں دیکھنا چاہتا
ہے۔ شہزادے نے تمام زیورات نکال کر سامنے رکھ دیے۔ بادشاہ نے وہ زیورات دیکھ کر کہا
کہ وہ چوں کہ اجنبی ہے، اس لیے یہ قیمتی زیورات فروخت کرتے ہوئے اس کے پکڑے
جانے کا اندیشہ ہے، اس لیے وہ ان زیوارت کی دگنی قیمت ادا کر رہا ہے، تاکہ اسے سفر میں
پریشانی نہ ہو۔ اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ شہزادے نے رقم لے کر اپنے سامان میں رکھ لی۔
رات کو انواع و اقسام کے کھانوں سے اس کی خاطر کی گئی اور خواب گاہ میں پہنچا کر اس کو
چُن مُن گڑیوں کا صندوقچہ دے کر آرام کرنے کو کہا گیا۔ بادشاہ نے خفیہ منصوبہ بنایا تھا کہ
جب شہزادہ دانیال یہاں سے رخصت ہو کر دولت پور جائے گا تو وہ اپنے خاص ساتھیوں کو

لے کر اپنی بیٹی کی تلاش میں جائیں گے اور کنیز کو عبرت ناک سزا دے کر اپنی بیٹی کو چھڑا لائیں گے۔

اُدھر جب شہزادہ دانیال کو بہت دنوں کے بعد آرام دہ بستر اور سکون بخش ماحول ملا تو وہ جلد ہی سو گیا۔ اچانک آدھی رات کو اسے کچھ عورتوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آئیں۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا کہ کہیں پھر تو وہ کسی طلسم میں گرفتار نہیں ہو گیا۔ اس نے دیکھا گڑیوں کا صندوقچہ کھلا ہوا ہے اور آواز اسی میں سے آ رہی ہے۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ صندوقچے میں روشنی ہوئی، تمام گڑیاں نکل کر باہر آ گئیں، تخت بچھا، ناچ گانا شروع ہوا۔ شہزادے کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے خواب میں محفل سجی ہو اور پریاں رقص کر رہی ہوں۔ وہ دم سادھے چپ چاپ دیکھتا رہا۔ جب ناچ گانا ختم ہوا تو جو گڑیا ملکہ بنی تخت پہ بیٹھی تھی، اس نے اپنے دائیں بائیں بیٹھی ہوئی گڑیوں سے کہا: ''کہانی سناؤ۔''

رقص کرنے والی گڑیاں مودب بیٹھ گئیں اور ملکہ کی دائیں جانب والی گڑیا نے کہا: ''کیا سناؤں، بس آنکھوں کی سُوئیاں رہ گئی تھیں۔ سو لونڈی بنی مالکن اور مالکن بنی لونڈی۔''

ملکہ گڑیا نے پوچھا: ''کیسے؟'' بائیں جانب والی گڑیا نے کہا: ''ایک دن ہوا یوں کہ شہزادی طلسمی ہرن کے پیچھے بھاگی، حویلی کا طلسمی دروازہ بند ہوا، شہزادی نے سوئے ہوئے شخص کی تمام سُوئیاں نکال دیں، بس آنکھوں کی سُوئیاں رہ گئی تھیں۔ سو باندی بنی شہزادی اور شہزادی بنی باندی۔'' یہ کہہ کر دونوں گڑیاں رونے لگیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

شہزادہ ساری بات سمجھ گیا اور زیورات ملنے کی بات بھی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پوری رات اس نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ صبح اُٹھ کر اس نے رات کا قصہ بادشاہ کو سنایا تو اس نے بھی ساری حقیقت بتا دی۔ اب یہ منصوبہ بنایا گیا کہ دانیال اور بادشاہ طلسمی حویلی جائیں گے اور بعد میں وہ اپنے وطن جائے گا، کیوں کہ اسے تو یہ بھی یاد نہ تھا کہ وہ کتنے عرصے طلسم میں قید رہا ہے۔ بادشاہ سلامت نے معلومات کے لیے اپنے اعتبار

...دولت آباد روانہ کیے اور خود شہزادے کے ساتھ طلسمی حویلی کی طرف روانہ ہوئے۔ ...گھنٹوں میں سب وہاں پہنچے۔ دروازہ گل رخ نے ہی کھولا، کیوں کہ وہ کنیز بنی ہوئی تھی۔ ...ادے کے اندر آتے ہی کنیز زمرد بولی: ''آپ میرے لیے زیور، کپڑے لائے؟''

''ہاں، میں تمھارے لیے بہت کچھ لایا ہوں، سب سے بڑھ کر یہ کہ تمھارے ...ان کو بھی ساتھ لایا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے آواز لگائی: ''آ جائیے حضور! آپ کی نورِ نظر آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہے۔''

بادشاہ سلامت اندر داخل ہوئے تو ان کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ بادشاہ کو دیکھتے ...زمرد تھر تھر کانپنے لگی اور دانیال کے قدموں میں گر پڑی۔

''حضور! مجھے معاف کر دیں، مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی۔''

دانیال نے اسے ٹھوکر مار کر اُٹھایا اور کہا: ''اصل واقعہ بیان کر، ورنہ تلوار سے ...گردن جدا کر دوں گا۔''

کنیز نے تمام روداد سنا دی اور معافی چاہی، لیکن بادشاہ نے کہا کہ وہ اسے معاف ...نہیں کریں گے، کیوں کہ اس نے بھید کھل جانے پر معافی مانگی ہے اور اسے آیندہ جب بھی ...موقع ملے گا یہ کسی نہ کسی کو ضرور نقصان پہنچائے گی، کیوں کہ دھوکا دینا اس کی عادت میں ...شامل ہے۔ اس نے احسان فراموشی بھی کی ہے۔ یہ ایک خانہ بدوش عورت کی اولاد ہے، ...جسے ہمارے یتیم خانے میں چھوڑ گئی تھی۔ ہم نے اسے تعلیم دلوا کر اپنی بیٹی کی خدمت پہ ...مامور کیا، جس نے اس سے ہمیشہ بھلائی کی اور اس نمک حرام نے یہ بدلہ دیا کہ اپنی مالکہ کو ...اپنی کنیز بنا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے زرہ برابر ہمارا اور ہماری بیٹی کا پیار یاد نہ آیا۔

شہزادہ دانیال آگے بڑھا اور گل رُخ سے بولا: ''آپ نے حقیقت کیوں نہیں بتائی؟''

شہزادی نے جواب دیا: ''میں کیسے بتاتی، وہ تو آپ کو ایک منٹ کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑتی تھی، پھر میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہ تھا۔''

''اچھا یہ بتاؤ! تم نے چُن مُن گڑیاں کیوں منگوائی تھیں؟ اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ گڑیاں بادشاہ کے پاس ملیں گی۔''

''میں جانتی تھی کہ چُن مُن گڑیوں کا نام سنتے ہی ابا حضور سمجھ جائیں گے کہ ان کی بیٹی کسی مصیبت میں ہے، کیوں کہ ان گڑیوں کا راز صرف میں، میرے والدین اور دونوں بہنوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔''

شہزادہ دانیال نے کہا: ''اگر تم ان گڑیوں کو نہ منگواتیں تو شاید مجھے کبھی پتا نہ چلتا کہ حقیقت کیا ہے۔''

ایک خادم نے آگے بڑھ کر بادشاہ سے پوچھا: ''اس نمک حرام اور احسان فراموش کنیز کے لیے کیا حکم ہے؟''

بادشاہ نے کہا: ''اس کو بندی خانے میں ڈال دو اور گھوڑوں کا چارہ بنانے کی ذمے داری اس پر ڈال دو۔'' خادم آگے بڑھے اور زمرد کو گرفتار کر لیا۔ ☆

اس بلاعنوان انعامی کہانی کا اچھا سا عنوان سوچیے اور صفحہ ۱۴۹ پر دیے ہوئے کوپن پر کہانی کا عنوان، اپنا نام اور پتا صاف صاف لکھ کر ہمیں ۱۸- جون ۲۰۱۱ء تک بھیج دیجیے۔ کوپن کو ایک کاپی سائز کاغذ پر چپکا دیں۔ اس کاغذ پر کچھ اور نہ لکھیں۔ اچھے عنوانات لکھنے والے تین نونہالوں کو انعام کے طور پر کتابیں دی جائیں گی۔ نونہال اپنا نام پتا کوپن کے علاوہ بھی علاحدہ کاغذ پر صاف صاف لکھ کر بھیجیں تا کہ ان کو انعامی کتابیں جلد روانہ کی جا سکیں۔

نوٹ: ادارۂ ہمدرد کے ملازمین اور کارکنان انعام کے حق دار نہیں ہوں گے۔

پینگولِن

رخسانہ جنید

پینگولن (PANGOLIN) انڈونیشیا، جنوب مشرقی ایشیا اور افریقا کے کچھ حصوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ درمیانے قد کا جانور ہے، جس کی لمبائی تین سے پانچ فیٹ تک ہوتی ہے۔ اس کی ٹانگیں چھوٹی، لیکن دُم لمبی، موٹی اور عجیب و غریب سی ہوتی ہے۔ پینگولن میں بڑی غیر معمولی اور عجیب و غریب خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو اسے دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس کی زبان لمبی اور لیس دار ہوتی ہے۔ یہ اپنی زبان پچیس سینٹی میٹر تک باہر نکال سکتا ہے۔ اس کی خوراک صرف چیونٹیاں ہیں۔ پینگولن جہاں بہت زیادہ چیونٹیاں دیکھتا ہے تو فوراً اپنی زبان باہر نکالتا ہے، چیونٹیاں اس کی زبان سے چپک جاتی ہیں اور وہ آسانی سے انھیں نگل لیتا ہے۔ چبانے کی زحمت اس لیے نہیں کرتا کہ اس کے منہ میں دانت نہیں ہوتے۔ غذا ہضم کرنے کا کام معدہ انجام دیتا ہے۔ بعض اوقات

اس کے معدے میں سنگ ریزے بھی ہوتے ہیں، جو غذا ہضم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

عام طور پر تقریباً تمام جانور اپنے بچاؤ کے لیے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں۔ کچھ جانوروں کے پنجے لمبے اور نوکیلے ہوتے ہیں، کچھ کے دانت بہت تیز ہوتے ہیں۔ بعض جانور خطرہ محسوس کرتے ہیں تو تیزی سے بھاگ جاتے ہیں اور شکاری کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ جانور تو اپنا رنگ تبدیل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، تب شکاری کو پتا ہی نہیں چلتا کہ یہاں کوئی جانور چھپا بیٹھا ہے۔ پینگولن کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے، نہ تو اس کے دانت تیز ہیں، نہ یہ تیز دوڑ سکتا ہے، البتہ اس کی کھال سخت ہوتی ہے۔ اس کے جسم پر نوکیلے چھلکے اس طرح لگے دکھائی دیتے ہیں جیسے کسی چھت پر ترتیب سے ٹائلیں (TILES) لگی ہوں۔

پینگولن جب خطرہ محسوس کرتا ہے تو اپنا سر سینے میں چھپا کر خود کو گیند کی طرح گول مول کر لیتا ہے اور شکاری کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ آسانی سے اس کا شکار کر سکے۔ جب تک خطرہ ٹل نہ جائے، پینگولن اسی حالت میں رہتا ہے۔ اگرچہ پینگولن کے پنجے تیز اور لمبے ہوتے ہیں، لیکن یہ اپنے بچاؤ کے لیے انھیں استعمال نہیں کرتا۔ یہ اپنے پنجے صرف سخت زمین کھودنے کے کام میں لاتا ہے، تاکہ زمین کے نیچے چھپی ہوئی چیونٹیوں کو کھا سکے۔ پینگولن درختوں پر تیزی سے چڑھ سکتا ہے اور اپنی طاقت ور دُم اور پنجوں کی مدد سے شاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے۔ پینگولن درخت پر اس لیے چڑھتا ہے کہ درختوں پر بھی اس کی من پسند چیونٹیاں موجود ہوتی ہیں۔

پینگوئن (PENGUIN) ایسا جانور ہے، جو پانی اور خشکی دونوں جگہ رہ سکتا ہے۔ پینگوئن کے سیاہ اور سفید پر نما بازو ہوتے ہیں، جن کی مدد سے یہ تیر سکتا ہے، لیکن اُڑ نہیں سکتا۔ یہ نہایت سرد علاقوں مثلاً انٹارکٹکا وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔ دو پایہ ہونے کی وجہ سے سیدھا کھڑا ہو کر چلتا ہے۔

وقت کا فرق

ثمینہ پروین

وہ سنار کی دکان سے ڈکیتی کی واردات کر کے بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ منھ کے بل گرا اور تڑپنے لگا۔ سنار لپک کر وہاں پہنچا اور لوٹے ہوئے زیورات کا تھیلا اُٹھا کر اپنے بیٹے کو دے دیا۔ تھوڑی دیر تڑپنے کے بعد ڈاکو ساکت ہو گیا۔ لوگ اس کے قریب جاتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ آخر بڑی عمر کے ایک شخص نے اسے سیدھا کیا اور سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، پھر انسانی ہمدردی کے طور پر لوگوں سے کہا: "اسے دل کا دورہ پڑا ہے، اسے فوراً اسپتال لے چلو۔ ممکن ہے اس کی جان بچ جائے۔"

لوگ اسے ٹیکسی میں ڈال کر قریبی سرکاری اسپتال چھوڑ آئے۔ اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ سنار نے ڈکیتی کی واردات کی رپورٹ درج کرادی۔

پولیس کہیں اور مصروف ہونے کی وجہ سے دو گھنٹے کے بعد سنار کی دکان پر پہنچی تھی۔ جو دکان دار جو ڈاکو کو اسپتال چھوڑ کر آئے تھے، وہ بھی وہیں موجود تھے۔ انسپکٹر اکبر نے گواہوں کے بیانات لیے اور اپنے دو اہل کاروں کے ساتھ اسپتال روانہ ہو گئے۔ اسپتال پہنچے تو دو بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے اور سرکاری ڈاکٹر مجرم کا طبی معائنہ کر چکے تھے۔ انسپکٹر نے ڈاکٹر سے پوچھا تو انھوں نے بتایا: "وہ یہاں آنے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔ ہارٹ اٹیک تھا۔"

"آپ ہمیں وہ لاش دکھا سکتے ہیں!"

"کیوں نہیں۔" پھر ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ کو بلا کر کہا: "امجد! انسپکٹر صاحب کو اس ڈاکو کی لاش دکھا دو، جو ڈکیتی کرتے ہوئے مر گیا تھا۔"

"آیئے جناب!" وہ انسپکٹر کو مردہ خانے میں لے گیا۔

لاش دیکھنے کے بعد انسپکٹر نے امجد سے پوچھا: ''اس کے پاس سے کوئی ایسا ... وغیرہ ملا، جس سے اس کی شناخت ہو سکے؟''

''نہیں، اس کی جیب سے کوئی چیز برآمد نہیں ہوئی۔'' امجد نے جلدی سے جواب ...

انسپکٹر نے گہری نظروں سے لاش کا معائنہ کیا۔ اس کے کپڑوں پر کہیں کہیں ... پینٹ کے داغ نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر نے اپنے ساتھ آنے والے اہلکار حیدر ...

''لگتا ہے، یہ رنگ روغن کا کام بھی کرتا تھا۔ ایسا کرو، تم اس کی تصویر بنا کر بڑی چورنگی جاؤ، جہاں سب مزدور کام کے انتظار میں بیٹھے ہیں، وہاں جا کر معلومات کرو، پھر ... رپورٹ دو۔''

حیدر اسی وقت بڑی چورنگی پہنچ گیا۔ وہاں مختلف کام کرنے والے بہت سار... مزدور جمع تھے۔ حیدر نے کئی مزدوروں کو تصویر دکھائی۔ آخر ایک آدمی نے تصویر دیکھ کر کہا: ''تو رجب علی کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔ یہ گھروں میں رنگ کرنے کا کام کرتا ہے، بہت جھگ... ہے، اس لیے کم ہی لوگوں سے اس کی دوستی ہے۔ کیا یہ کسی جھگڑے میں پکڑا گیا ہے؟''

''تمھیں معلوم ہے، یہ رہتا کہاں ہے؟'' حیدر نے اس کے سوال کا جواب ... بغیر پوچھا۔

''قریب ہی رہتا ہے جی! آیئے، آپ کو اس کا گھر دکھاتا ہوں۔''

چند گلیاں چھوڑ کر ایک گلی کے کونے پر رک کر بولا: ''دیکھیے، اس گلی میں اُلٹے ... پر چوتھا مکان اسی کا ہے۔''

حیدر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تھانے پہنچ کر انسپکٹر اکبر نواز کو رپورٹ ...

''سر! پتا چل گیا ہے۔ اس کا نام رجب علی ہے۔ میں اس کا گھر بھی دیکھ آیا ہوں۔''

''ویری گڈ، اچھا کام کیا ہے، اب گاڑی نکالو، اس کے گھر چلنا ہے۔''

گھر کا دروازہ لوہے کا تھا، جو زنگ لگنے کی وجہ سے جگہ جگہ سے گل گیا تھا۔ دروازے پر پڑا ہوا کپڑے کا پردہ انتہائی میلا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک بوڑھی عورت پردے کے پیچھے سے بولی: ''کون ہے؟'' پھر پولیس کو دیکھ کر پریشانی سے بولی: ''کیا بات ہے؟''

''رجب علی یہیں رہتا ہے؟''

''ہاں، یہیں رہتا ہے، مگر وہ گھر پر نہیں ہے۔''

''ہمیں معلوم ہے، مگر کیا وہ کچھ کہہ کر گیا تھا کہ کہاں جا رہا ہے؟''

''نہیں، دوپہر ایک بجے گھر سے چائے پی کر کہیں چلا گیا تھا۔''

''ایک بجے؟'' انسپکٹر نے حیرت سے حیدر کی طرف دیکھا۔ اس دوران پولیس موبائل دیکھ کر گلی کے کچھ اور لوگ بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ انسپکٹر نے پھر پوچھا: ''کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ ایک بجے گھر میں ہی تھا؟''

''جی ہاں، وہ بارہ بجے تو سو کر اُٹھا تھا۔''

انسپکٹر نے قریب کھڑے ہوئے لوگوں سے پوچھا: ''آپ میں سے کسی نے رجب علی کو یہاں سے جاتے وقت دیکھا تھا؟''

''اماں جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' ایک آدمی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا: ''میں ایک بجے گلی کے کونے پر کھڑا اپنے بچوں کی اسکول وین کا انتظار کر رہا تھا، جب وہ وہاں سے گزرا۔''

''اس سے آپ کی کوئی بات ہوئی تھی، جس سے پتا چل سکے کہ وہ کہاں جانے والا تھا؟''

''نہیں، لیکن میں نے اسے حسن بینک کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس کا ایک دوست وہاں کام کرتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اس سے ملنے جاتا تھا۔ شاید وہیں گیا ہو۔''

انسپکٹر نے بڑی بی سے پوچھا: ''آپ رجب علی کی والدہ ہیں؟''

''ہاں، مگر بات کیا ہے؟ رجب علی نے کیا کیا ہے؟ کہاں ہے وہ؟''

''ماں جی! بہت افسوس کی خبر ہے، ہمیں بتاتے ہوئے دکھ ہو رہا ہے کہ آپ کا بیٹا مر چکا ہے۔''

بوڑھی عورت چند لمحے انسپکٹر کو اس طرح دیکھتی رہی، جیسے انسپکٹر کی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو، پھر وہ چکرا کر گرنے ہی والی تھی کہ محلے کی ایک عورت نے سنبھال لیا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو وہ روتے ہوئے بولی: ''کہاں ہے رجب علی؟ مجھے اس کے پاس لے چلو۔''

اسپتال کے مردہ خانے میں اپنے بیٹے کی لاش دیکھ کر وہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ انسپکٹر اکبر نواز عجیب الجھن میں مبتلا تھا۔ رجب علی کو گیارہ بجے اسپتال لایا گیا۔ ڈاکٹر کا بھی یہی کہنا ہے کہ تقریباً گیارہ بجے اس کی موت واقع ہو چکی تھی، جب کہ اس کی ماں اور محلے والوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک بجے گھر سے نکلا تھا۔

انسپکٹر نے بڑی بی کو تسلی دے کر گھر چھوڑا اور حسن بینک جا پہنچا۔ بینک میں کھانے کا وقفہ ہو چکا تھا۔ منیجر کے کہنے پر اسے اندر بلا لیا گیا۔ انسپکٹر نے منیجر سے کہا: ''میں ایک کیس کی تفتیش کر رہا ہوں۔'' پھر جیب سے تصویر نکال کر دکھاتے ہوئے کہا: ''یہ شخص آج آپ کے بینک میں آیا تھا۔ معلوم یہ کرنا ہے کہ یہاں کس وقت پہنچا تھا؟ آپ نے یا بینک کے عملے میں سے کسی نے اسے دیکھا ہو۔''

منیجر نے اپنا چشمہ درست کر کے تصویر کو غور سے دیکھا: ''ہاں، شاید یہ وہی شخص ہے جو ہمارے کلرک عرفان سے بات کر رہا تھا۔''

منیجر نے عرفان کو بلا لیا۔ وہ سنجیدہ چہرے اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ انسپکٹر نے اسے بھی تصویر دکھائی: ''آپ اسے جانتے ہیں؟''

عرفان نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا: ''ہاں، جانتا ہوں۔ یہ کبھی کبھی مجھ سے ملنے آتا ہے۔''

''کیوں؟''

''میری اس سے معمولی سی جان پہچان ہے، غریب آدمی ہے، اس لیے میں اس کی مالی مدد کر دیتا ہوں۔''

''آج یہ کس وقت آیا تھا؟''

''دوپہر تقریباً سوا ایک بجے، کیوں کہ ڈیڑھ بجے بینک بند ہو جاتا ہے۔ کیا یہ کسی ... میں پکڑا گیا ہے؟''

''یہ مر گیا ہے۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر نے عرفان کی طرف دیکھا تو اسے ایسا محسوس ... اس کی موت کا سن کر عرفان کے چہرے پر اطمینان کا رنگ آ کر گزر گیا ہو۔

تھانے پہنچ کر انسپکٹر نے رپورٹ لکھنی شروع کی تو وہ پھر الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے ... سے اس سلسلے میں مشورہ کیا: ''سمجھ میں نہیں آتا، یہ چکر کیا ہے! دکان داروں کا کہنا ہے ... گیارہ بجے واردات ہوئی اور ہم فوراً ہی اسے اسپتال لے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے بھی اسی ... موت کی تصدیق کر دی ہے۔ دوسری طرف مرنے والے کی ماں اور محلے والے کہتے ... کہ ایک بجے ہم نے اسے جاتے دیکھا ہے۔ بینک منیجر کی گواہی سے بھی یہ بات صحیح ... ہوتی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنی موت کے دو ڈھائی گھنٹے بعد تک زندہ ... گیا ہو۔ آخر کیا راز ہے!''

''سر! یہ کوئی روحانی چکر لگتا ہے، مرنے کے بعد اس کی روح بھٹک رہی ہوگی۔'' ... بڑی دور کی کوڑی لایا تھا۔

''اچھا تو اب تھانے میں ایک عامل کو بھی رکھنا پڑے گا۔''

''مذاق کر رہا تھا سر! میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا ہے۔''

انسپکٹر کے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا۔ وہ ایک بار پھر سنار کی دکان پر پہنچا اور

دکان داروں سے کہا: ''آپ میں سے جن لوگوں اسے غور سے دیکھا تھا، براہِ مہربانی ان میں سے دو آدمی میرے ساتھ اسپتال چل کر اسے دوبارہ شناخت کرلیں۔''

اسپتال پہنچ کر ان دونوں کو رجب علی کی لاش دکھائی گئی تو وہ فوراً بول اُٹھے: ''نہیں، یہ وہ شخص نہیں ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے۔''

اسی وقت ڈاکٹر کے اسسٹنٹ امجد کو بلا لیا گیا۔ انسپکٹر نے اس پر کڑی نظر ڈالتے ہوئے پوچھا: ''صبح گیارہ بجے جو شخص انتقال کر گیا تھا، وہ یہی ہے؟''

''جی ہاں، یہی ہے۔''

انسپکٹر نے دونوں دکان داروں کی طرف اشارہ کیا: ''یہ دونوں صبح اسے لے کر آئے تھے۔ ان چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ یہ وہ شخص نہیں ہے۔''

''ان کو دھوکا ہو رہا ہے۔'' امجد کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ انسپکٹر نے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ بھی دیکھ لیے تھے۔

''اچھا!'' انسپکٹر نے غور سے امجد کو دیکھتے ہوئے کہا: ''اب مردہ خانے میں جتنی لاشیں ہیں، ایک ایک کر کے سب کے چہرے دکھاؤ۔''

امجد کو مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ دونوں دکان دار غور سے دیکھ رہے تھے۔ ایک چہرہ دیکھ کر وہ دونوں ایک ساتھ بول اٹھے: ''یہی ہے جناب! یہ وہی ہے۔''

مزید تصدیق کے لیے ڈاکٹر صاحب کو بھی بلایا گیا۔ انھوں نے کہا: ''ہاں، اسے میں نے تقریباً گیارہ بجے چیک کیا تھا۔''

انسپکٹر نے رجب علی کی لاش کی طرف اشارہ کیا اور حیرت سے کہا: ''مگر آپ کے اسسٹنٹ نے تو ہمیں اس شخص کی لاش دکھائی تھی! آخر اس نے ایسا کیوں کیا؟''

ڈاکٹر نے پسینے میں ڈوبے ہوئے امجد کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا۔

انسپکٹر نے کہا: ''ہم امجد کو تھانے لے جا رہے ہیں۔''

تھانے پہنچ کر امجد نے اصل بات اگل دی: ''رجب علی رنگ روغن کا کام کرتا تھا۔ وہ میٹرک تک پڑھا ہوا بھی تھا۔ ایک دفعہ وہ ہمارے گھر پر کام کر رہا تھا، تب میرے بڑے بھائی عرفان سے اس کی دوستی ہو گئی۔ بھائی حسن بینک میں ملازم ہیں۔ پھر عرفان بھائی کا کوئی راز رجب علی کے ہاتھ لگ گیا اور وہ بہانے بہانے سے رقم کا مطالبہ کرنے لگا۔ بھائی نے مجھے کبھی تفصیل نہیں بتائی تھی، لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ رجب علی بھائی کو دھمکیاں دیتا ہے اور بھائی اس سے تنگ آ چکے ہیں۔ آج تقریباً دس بجے یہ اسپتال آیا تھا۔ کسی موٹر سائیکل سے ہلکی سی ٹکر سے اس کے گھٹنے پر چوٹ لگی تھی۔ یہ اسپتال قریب تھا اس لیے وہ یہیں آ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اسے دیکھ کر میں نے سوچا کہ آج اچھا موقع ہے۔ اس سے اپنے بھائی کی جان چھڑا دوں۔ میں نے اس کے زخم پر دوا لگائی اور تسلی دیتے ہوئے کہا کہ میں تمھیں درد دور کرنے والا انجکشن لگا دیتا ہوں، ابھی آرام آ جائے گا۔ اس بہانے میں نے زہر کا انجکشن لگا دیا، جس سے وہ اُسی وقت مر گیا۔ پھر میں نے رجب علی کی لاش مردہ خانے میں رکھ دی۔ میں چاہتا تھا، لاش کے ساتھ یہ جرم بھی جلد سے جلد دفن ہو جائے۔ سیدھی سادی بات تھی، ایک آدمی چوری کر کے بھاگا، اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور گر کر مر گیا۔ بہت سارے لوگ گواہ تھے۔''

''تم نے اپنی سوچ کے مطابق یہ سب ٹھیک کیا، لیکن دو ڈھائی گھنٹے کے فرق نے تمھاری پول کھول دی۔ تم نے ایک ماں سے اس کا سہارا چھین لیا۔ تمھیں تو سزا ملے ہی گی، لیکن تمھارے خاندان کی کتنی بدنامی ہوگی، تمھارے گھر والے سب سے منھ چھپاتے پھریں گے۔''

امجد دونوں ہاتھوں سے منھ چھپا کر رونے لگا۔

☆

مجھے دیکھو

مسعود احمد برکاتی

لغت کہتی ہے کہ مجھے دیکھو، میں تمھاری دوست ہوں، خادم ہوں، مددگار ہوں، استاد ہوں، ہمدرد ہوں۔ میں تمھیں پریشانی سے بچاتی ہوں۔ شرمندگی سے بچاتی ہوں، نقصان سے بچاتی ہوں۔ میں تمھاری عزت بڑھاتی ہوں، تمھیں طاقت بخشتی ہوں۔ تمھیں ایسے نئے دوستوں سے ملاتی ہوں، جو ہر بُرے وقت میں تمھارے کام آتے ہیں، جو تمھارا سر نیچا نہیں ہونے دیتے۔

تم کسی لفظ کو سمجھتے ہو کہ وہ تو تمھارا غلام ہے، اس لیے اس کو اہمیت نہیں دیتے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ جب ضرورت ہوگی، جب دل چاہے گا، اس غلام سے کام لے لیں گے۔ جس طرح چاہیں گے، جس جملے میں چاہیں گے، کام لیں گے۔ وہ ہر وقت، ہر طرح تمھاری خدمت اور تمھارا حکم بجالانے کے لیے تیار ہے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب موقع آیا تو جس کو غلام سمجھ رہے تھے، وہ غلام تو کیا ہوتا دوست بھی نہ نکلا، بلکہ دشمن جیسا نکلا۔ دشمن یوں کہ تم اس لفظ کے جو معنی سمجھ رہے تھے وہ معنی نہ نکلے، تم اس لفظ کے جو ہجے صحیح سمجھتے تھے وہ صحیح نہیں تھے۔ اب تم سر پکڑے بیٹھے ہو۔ یہ کیا ہوا؟! افسوس، ہم غلط سمجھے۔

اگر ہم پہلے ہی اس غلام پر توجہ دے لیتے اور اس کو اچھی طرح پہچان لیتے کہ اس کے اصلی معنی کیا ہیں؟! اس کو کس طرح لکھتے ہیں، کس طرح پڑھتے ہیں، کس طرح تلفظ کرتے ہیں تو وقت پڑنے پر یہ دھوکا نہ ہوتا اور ہم واقعی اس لفظ کو اپنا غلام بنا لیتے۔ جس چیز پر آدمی کو پورا قابو نہ ہو وہ کیسے غلام ہو سکتی ہے۔ غلام تو اسی کو کہتے ہیں نا کہ جس پر ہمارا حکم پوری طرح چلے۔ جب ہم کسی لفظ پر عبور ہی نہیں رکھتے تو پھر اس کو غلام کس طرح بنا سکتے ہیں۔ الفاظ اُنھی کے غلام ہوتے ہیں جو ان سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں، جو ان کی پوری اصلیت کو سمجھتے ہیں۔ الفاظ کو غلام بنانا ہے تو ان کے معنی جانو، ان کو سمجھو، ان کے جتنے معنی ہیں اُن سب سے واقف ہو جاؤ۔ یہ بھی جانو کہ وہ تمھاری زبان میں آنے کے بعد اُن کی پہلی صورت باقی رہی یا بدل گئی۔ زیر زبر پیش میں فرق تو نہیں آیا، معنی میں فرق تو نہیں آیا۔ کوئی لفظ جب تنہا استعمال ہوتا ہے تو اس کے کیا معنی ہوتے ہیں اور جب کسی دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر استعمال ہوتا ہے تو وہ کیا معنی دیتے ہیں۔ یہ بھی سمجھ لو تو اچھا ہے کہ کیا زمانے کے ساتھ ساتھ اُن کے معنی میں بھی کوئی تبدیلی آئی ہے، پہلے معنی کچھ تھے، اب کچھ اور ہو گئے۔

بعض لفظ ایسے ہوتے ہیں کہ زیر زبر پیش کے فرق سے اُن کے معنی بدل جاتے ہیں۔ زیر ہو تو معنی کچھ ہوں گے اور زبر ہو تو کچھ اور۔

ان سب باتوں کو جاننے کے لیے، دشمن کو دوست بنانے کے لیے تمھیں میری ضرورت ہوگی یعنی صرف ایک کتاب کی ضرورت ہوگی اور وہ کتاب ہے لغت کی کتاب۔ لغت تمھیں یہ سب باتیں بتائے گی اور عزت، طاقت، مسرت سے ہم کنار کرے گی۔ بس اس کا کہا مانو۔ اس کو دیکھا کرو۔ تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی۔

☆

عقل یا جنون

کسی فلسفی سے اس کے شاگرد نے سوال کیا: ”استاد! اگر کسی انسان کا عقل سے کام نہ نکلے تو وہ کیا کرے؟“

فلسفی نے جواب دیا: ”اسے جنون سے کام لینا چاہیے، کیوں کہ دنیا کے عظیم الشان اور یادگار کام جنون ہی سے انجام پائے ہیں۔“

مرسلہ: محمد اکرم وارثی، کراچی

معلومات افزا

سلیم فرخی

معلومات افزا کے سلسلے میں حسبِ معمول سولہ سوالات دیے جا رہے ہیں۔ سوالوں کے سامنے تین جوابات بھی لکھے ہیں، جن میں سے کوئی ایک صحیح ہے۔ کم سے کم گیارہ صحیح جوابات دینے والے نونہال انعام کے مستحق ہوں گے، لیکن انعام کے لیے گیارہ سے زیادہ صحیح جوابات بھیجنے والے نونہالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ اگر ۱۶ جوابات صحیح دینے والے نونہال ۱۵ سے زیادہ ہوئے تو پندرہ نام قرعہ اندازی کے ذریعے سے نکالے جائیں گے۔ قرعہ اندازی میں شامل ہونے والے باقی نونہالوں کے صرف نام شائع کیے جائیں گے۔ گیارہ سے کم صحیح جوابات دینے والوں کے نام شائع نہیں کیے جائیں گے۔ کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ جوابات صحیح دیں اور انعام میں ایک سو روپے نقد حاصل کریں۔ صرف جوابات (سوالات نہ لکھیں) صاف صاف لکھ کر کوپن کے ساتھ اس طرح بھیجیں کہ ۱۸- جون ۲۰۱۱ء تک ہمیں مل جائیں۔ جوابات کے کاغذ پر بھی اپنا نام پتا بہت صاف لکھیں۔ ادارہ ہمدرد کے ملازمین / کارکنان انعام کے حق دار نہیں ہوں گے۔ ☆

۱۔ حضرت سلیمانؑ .... کے بیٹے تھے۔ (حضرت نوحؑ ۔ حضرت داؤدؑ ۔ حضرت ہودؑ)

۲۔ مسجدِ نبوی کی تعمیر ہجرت کے .... سال میں شروع ہوئی۔ (پہلے ۔ دوسرے ۔ تیسرے)

۳۔ پہلے اموی خلیفہ .... تھے۔ (عبدالرحمٰن اول ۔ امیر معاویہؓ ۔ عباس السفاح)

۴۔ کوفہ .... کا مشہور تاریخی شہر ہے۔ (عراق ۔ ایران ۔ یمن)

۵۔ مشہور یونانی فلسفی ارسطو، افلاطون کا .... تھا۔ (والد ۔ بھائی ۔ شاگرد)

۶۔ مشہور شاعر .... کا خاندانی پیشہ خیمہ سازی تھا۔ (عمر خیام ۔ البیرونی ۔ الفارابی)

۷۔ پاکستان میں مہاجرین اور آباد کاری کے پہلے وزیر .... تھے۔
(محمد ایوب کھوڑو ۔ خواجہ ناظم الدین ۔ راجا غضنفر علی خاں)

۸۔ قائداعظم کے دوست بہادر یار جنگ کا انتقال .... میں ہوا تھا۔ (۱۹۳۸ء ۔ ۱۹۴۰ء ۔ ۱۹۴۴ء)

۹۔ خان افتخار حسین ممدوٹ .... کے پہلے وزیرِ اعلا تھے۔ (سندھ ۔ پنجاب ۔ بلوچستان)

۱۰۔ .... کا اصل نام محی الدین احمد تھا۔ (مولانا ابوالکلام آزاد ۔ مولانا محمد علی جوہر ۔ مولانا ظفر علی خاں)

۱۱۔ سب سے پہلا نشانِ حیدر .... کو دیا گیا تھا۔ (میجر عزیز بھٹی ۔ میجر طفیل محمد ۔ کیپٹن سرور شہید)

...کی کے شہر سمرنا کا نیا نام .... ہے۔ (انقرہ ۔ ازمیر ۔ استنبول)

OSTRICH انگریزی زبان میں .... کو کہتے ہیں۔ (چکور ۔ کوئل ۔ شترمرغ)

مشہور انقلابی لیڈر فیدل کاسترو کا تعلق .... سے ہے۔ (کیوبا ۔ کمبوڈیا ۔ کینیا)

اردو زبان کا ایک محاورہ ہے: "........ طبق روشن ہونا۔" (بارہ ۔ چودہ ۔ سولہ)

الٰہی بخش معروف کے اس شعر کا دوسرا مصرع درست کیجیے:

کہاں تک رازِ دل افشا نہ کرتا
مثل یہ ہے کہ .... کیا نہ کرتا
(گرتا ۔ مرتا ۔ روتا)

کوپن برائے معلومات افزا نمبر ۱۸۶ (جون ۲۰۱۱ء)

نام : ....

پتا : ....

....

....

کوپن پر صاف صاف نام، پتا لکھیے اور اپنے جوابات (سوال نہ لکھیں، صرف جواب لکھیں) کے ساتھ لفافے میں ڈال کر دفتر ہمدرد نونہال، ہمدرد ڈاک خانہ، کراچی ۷۴۶۰۰ کے پتے پر اس طرح بھیجیں کہ ۱۸/ جون ۲۰۱۱ء تک ہمیں مل جائیں۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام لکھیں۔ کوپن کو کاٹ کر جوابات کے صفحے پر چپکا دیں۔

کوپن برائے بلاعنوان انعامی کہانی (جون ۲۰۱۱ء)

عنوان : ....

نام : ....

پتا : ....

....

....

یہ کوپن اس طرح بھیجیں کہ ۱۸/ جون ۲۰۱۱ء تک دفتر پہنچ جائے۔ بعد میں آنے والے کوپن قبول نہیں کیے جائیں گے۔ ایک کوپن پر ایک ہی نام اور ایک عنوان لکھیں۔ کوپن کو کاٹ کر کاپی سائز کے کاغذ پر درمیان میں چپکائیے۔

بے داغ منصوبہ

اشتیاق احمد

"آج شام ٹھیک چار بجے عمارت نمبر ایک میں پہنچو، منصوبہ تیار ہے، باس۔"

باس کا پیغام پڑھ کر ان کی باچھیں کھل گئیں۔ باس جب کوئی منصوبہ بناتا تھا، لمبا ہی مال ہاتھ آتا تھا۔ وہ تینوں باس کی ذہانت کے قائل تھے۔ جانتے تھے کہ باس کا منصوبہ کبھی نامکمل نہیں ہوتا، وہ ہر لحاظ سے مکمل ہوتا ہے۔ منصوبے کے ہر رخ پر وہ بار بار سوچتا، لکھ لکھ کر کاٹتا اور آخر ایک بے داغ منصوبہ ترتیب دینے میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ انھیں بتاتا تھا۔ سارا منصوبہ بہت اچھی طرح انھیں سمجھاتا تھا اور جب اس کے خیال میں وہ منصوبے پر عمل کرنے کے قابل ہو جاتے، جب اس پر عمل کرنے کی اجازت دے دیتا تھا۔

مال کی تقسیم کا بھی اس کا ایک اصول تھا۔ کل مال کا نصف اس کا، باقی مال ان تینوں میں برابر تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح انھیں اپنے باس سے کوئی شکایت نہیں تھی، نہ آج تک باس کو ان سے کوئی شکایت ہوئی تھی۔

معاشرے میں وہ بظاہر بہت باعزت اور مال دار لوگوں کے طور پر رہتے تھے۔ ان کے پڑوسیوں کو کبھی شک نہیں گزرا تھا کہ ان کے آس پاس کون لوگ رہتے ہیں۔ باس کا تو اپنا الگ ٹھکانا تھا، لیکن وہ تینوں کریم پارک میں رہتے تھے۔ سارے محلے کے لوگوں سے انھوں نے تعلقات بنا کر رکھی تھی۔ وہ مشکل وقت میں ان کے کام بھی آتے تھے، ان کی مالی مدد بھی کرتے تھے، اس لیے سارے محلے والوں کے نزدیک وہ تینوں بہت ہی شریف اور اچھے انسان تھے۔

کریم پارک، حسن کالونی میں ان کی شان دار کوٹھی تھی۔ ان کے پاس ایک بہترین کار تھی، جس میں وہ آتے جاتے تھے۔ محلے کے لوگ انھیں احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سب کو یہ معلوم تھا کہ وہ کاروباری لوگ ہیں۔ تینوں کا مشترکہ کاروبار ہے۔ محلے کے ایک

معزز شخص سیٹھ جمال صاحب نے ان سے ایک بار پوچھا تھا: ''آپ لوگوں نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ آپ کیا کاروبار کرتے ہیں؟''

تب انھوں نے بتایا تھا: ''ہمارا کاروبار یہ ہے کہ ملوں میں تیار ہونے والے کپڑے کا سودا ملوں ہی میں طے کر لیتے ہیں اور پھر خریداروں کو ملوں ہی میں کپڑا دکھا کر اسے فروخت کرتے ہیں۔ مل مالکان کو اس میں آسانی محسوس ہوتی ہے کہ وہ چند آدمیوں کو اپنا سارا مال نقد دے دیں۔ اس طرح وہ بہت سی پریشانیوں سے بچ جاتے ہیں۔''

ان حالات میں ظاہر ہے، انھیں کسی باقاعدہ دفتر کی ضرورت نہیں تھی، لہٰذا محلے کا کوئی شخص اگر ان سے کسی کام کے سلسلے میں ان کے دفتر کا پتا پوچھتا تو وہ بتاتے: ''ہمارا کوئی باقاعدہ دفتر نہیں، نہ ہمیں ضرورت ہے، کیوں کہ ہمارا کام تو دراصل لین دین کا ہے۔''

اور وہ اپنے کام کی تفصیل کسی حد تک بتا دیتے۔ اس طرح کسی کو آج تک ان پر شک نہیں گزرا تھا۔ یوں بھی وہ سب کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک کرتے تھے اور محلے کی کسی چیز کی طرف لالچ کی نظر نہیں ڈالتے تھے۔ نہ انھوں نے اپنے محلے میں کبھی کوئی واردات کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو بس اپنے باس کے منصوبوں پر عمل کرنے کے عادی تھے۔

کریم پارک، حسن کالونی میں یہ کوٹھی انھوں نے چند سال پہلے خریدی تھی۔ ہر چند سال بعد کوٹھی تبدیل کر دینے کی ہدایت بھی انھیں باس کی طرف سے ملی تھی۔ جہاں چند سال گزرتے، وہ انھیں حکم دے دیتا: ''بس اب یہ کوٹھی چھوڑ دو۔ کوئی اور کوٹھی کسی اور محلے میں تلاش کرلو۔''

ان کے نام ثاقب، کاشف اور شہزاد تھے۔ ان کے پاس انھی ناموں سے شناختی کارڈ موجود تھے۔ گاڑی وغیرہ کے کاغذات بھی مکمل ہوتے تھے۔ معاملات کے صاف تھے۔ کسی کا [illegible] پیسہ مارنے کی انھیں بالکل عادت نہیں تھی، لہٰذا یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ محفوظ جرائم پیشہ لوگ تھے۔

ٹھیک چار بجے وہ عمارت نمبر ایک کے دروازے پر پہنچ گئے۔ باس شاداب نگر کی ایک کوٹھی میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتا تھا، تاہم ان کی ملاقاتیں یہیں ہوتی تھیں۔ بیوی بچوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ ''باس'' صاحب کیا کام کرتے ہیں۔ معاشرے میں وہ سیٹھ حیات کہلاتا تھا۔ اس کا ایک کاروباری دفتر بھی تھا۔ اس میں چند ملازم کام کرتے تھے۔ یہ دفتر اور ملازم اس نے اس لیے رکھے تھے کہ کوئی یہ سوال نہ کرے کہ سیٹھ صاحب آپ کام کیا کرتے ہیں۔ وہ اس دفتر میں چند گھنٹے روزانہ جاتا بھی تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا کاروباری دفتر تھا، یعنی کوئی فرضی دفتر نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ سیٹھ صاحب روئی کے بیوپاری ہیں۔ کھیتوں سے آنے والی روئی خریدنا، اسے گودام میں رکھوانا اور پھر شہر کو سپلائی کرنا، یہ تھا باس کا کاروبار۔ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ جو کام وہ کرتا تھا، اس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا۔

ثاقب نے دروازے کی گھنٹی بجائی تو باس کے ملازم نے دروازہ کھولا۔ وہ انھیں اچھی طرح پہچانتا تھا۔

''ہمارے دوست سیٹھ صاحب ہیں؟'' ثاقب نے اس طرح کہا، جیسے خود اپنے پروگرام کے تحت ملنے کے لیے آگئے ہوں۔

''جی ہاں! موجود ہیں۔ آپ ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیے، میں انھیں بتاتا ہوں۔''

''شکریہ، حلیم بھائی!'' کاشف نے کہا۔

ان میں کاشف لمبے قد کا خوب صورت نوجوان تھا۔ اس کے بال سیاہ تھے، آنکھیں بھی سیاہ تھیں اور ناک لمبی۔ ثاقب کا قد درمیانہ، چہرہ گول اور آنکھیں بھوری، بال سنہری مائل تھے۔ شہزاد چھوٹے قد کا تھا، لیکن بہت سڈول تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی اور بال سرخی مائل تھے۔

تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور باس اندر داخل ہوا۔ تینوں کھڑے ہوگئے۔

"کیسے ہو دوستو!"

"جی ٹھیک ٹھاک۔"

باس نے ڈرائنگ روم کا دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ اب ان کی آواز کمرے سے باہر نہیں جاسکتی تھی۔ اس کمرے کے دروازے ایسے تھے کہ آواز باہر جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

"وقت ضائع کیے بغیر میں وضاحت کیے دیتا ہوں۔ پہلے تو تم یہ نقشہ دیکھ لو! یہ جیل روڈ ہے۔ یہ رہا جیل کا بڑا گیٹ۔ ہم اس سے آگے چلیں تو بائیں طرف پہلی سڑک جو مڑ رہی ہے، وہ ایوان ٹاؤن کی سڑک ہے۔ ایوان ٹاؤن کی سڑک پر مڑتے ہیں تو دائیں طرف ایک سڑک مڑ رہی ہے، یہ ایوان ٹاؤن کے اے بلاک کی سڑک ہے۔ اس پر ساتویں کوٹھی کا نمبر 40.A ہے۔ یہ کوٹھی ہمارا نشانہ ہے۔ اب کوٹھی کا نقشہ سن لو۔ نیلے رنگ کا لوہے کا بڑا گیٹ ہے۔ گیٹ کھلتا ہے تو دونوں طرف لان ہیں۔ ان میں پھل دار درخت اور پھولوں کے پودے لگے ہیں۔ روش پر آگے بڑھتے ہیں تو سامنے کوٹھی ہے۔ یہ گول ہے۔ چاروں طرف پہلے برآمدہ ہے، کافی کشادہ برآمدہ۔ برآمدے میں چلنا شروع کریں تو کمروں کے دروازے آنے شروع ہوتے ہیں۔ پورا چکر لگالیں تو سات کمرے بنتے ہیں۔ گویا کوٹھی کے کل سات کمرے ہیں۔ ان کمروں کے دروازے پشت کی طرف بھی کھلتے ہیں۔ کوٹھی کی پوری گولائی کے درمیان بھی ایک جگہ ہے۔ اس جگہ کو بھی باغ کی شکل دی گئی ہے اور دیکھا جائے تو یہ باغ بہت ہی خوب صورت ہے۔ مطلب یہ کہ تمام کمروں سے اس باغ میں آسکتے ہیں اور باغ سے ان کمروں میں آسکتے ہیں اور بیرونی باغ میں بھی آسکتے ہیں۔ بس یہ تو مکان کا نقشہ۔ دروازے پر چوبیس گھنٹے دو مسلح پہرے دار رہتے ہیں۔ ہر آٹھ گھنٹے بعد ان کی ڈیوٹی تبدیل ہوتی ہے۔ ڈیوٹی صبح آٹھ بجے، شام کو چار بجے اور رات کو بارہ بجے تبدیل ہوتی ہے۔ پہلے پہرے دار آتے ہیں، پھر پہرے پر موجود دونوں پہرے دار جا

ہیں، یعنی مین گیٹ پر ہر وقت کوئی پہرے دار ہوتا ہے۔ کوٹھی کی بیرونی دیواریں بیس فٹ اونچی ہیں۔ دیوار تک صرف سیڑھی کے ذریعے سے پہنچا جاسکتا ہے اور دوسری طرف سیڑھی لگا کر اندر اُترا جاسکتا ہے، یا پھر مین گیٹ سے اندر داخل ہوا جاسکتا ہے۔ اب کوٹھی کے رہنے والوں کے بارے میں بتاتا ہوں۔ کوٹھی کا مالک آثم جلالی ہے۔ اس کی ایک بیوی اور تین بچے ہیں۔ بیوی کا نام شازیہ جلالی اور بچوں کے نام عامر، عاقل اور ماریہ ہیں۔ گھر کے دو ملازم ہیں، نور جان اور شاہ جہاں، یہ دونوں سگے بھائی ہیں۔ اس گھر کے پرانے ملازم ہیں، بلکہ ان کا باپ بھی آثم کا ملازم تھا۔ اس کے مرنے کے بعد انھیں رکھ لیا گیا۔ گھر کا مالک آثم جلالی کپڑے کی ایک بہت بڑی مل کا اکیلا مالک ہے۔ اس کی ہزاروں روپے روزانہ کی آمدنی ہے۔ اس کی تجوری میں نقد رقم کے علاوہ سونے اور وائٹ گولڈ کے زیورات کے علاوہ ہیرے جواہر بھی بہت ہوتے ہیں۔ تجوری بہت جدید ہے۔ اگر کوئی چور اسے کھول بھی لے تو الارم بج اٹھتے ہیں۔ اس تجوری کا راز جاننے کے لیے مجھے بہت کوشش کرنی پڑی۔ بہت خرچ کرنا پڑا اور اب ہم اس قابل ہیں کہ تجوری کو کھول بھی لیں اور اس کے الارم بھی نہ بجیں۔ اندر داخل ہونے کے لیے، رسی کی سیڑھی استعمال کی جاسکتی ہیں یا پھر لکڑی کی سیڑھی۔ تیسرا طریقہ مین گیٹ کے ذریعے اندر داخل ہونا ہے۔ اس کے لیے پہرے داروں کا انتظام کرنا ہوگا۔ لکڑی کی سیڑھی مشکلات پیدا کرسکتی ہے۔ رسی کی سیڑھی دیوار میں کیسے پھنسائی جاسکے گی، یہ دشواری ہے، لہٰذا ہمیں مین گیٹ کے ذریعے سے ہی اندر داخل ہونا پڑے گا۔ مین گیٹ کو رات کے وقت تالا لگادیا جاتا ہے، لیکن یہ تالا باہر لگایا جاتا ہے، اندر نہیں۔ دروازے کی چابیاں پہرے داروں کے پاس ہوتی ہیں۔ گویا ہمیں دونوں کو بے ہوش کرکے اندر داخل ہونا پڑے گا۔ تم کل دن میں وہاں کا چکر لگا لو۔ اچھی طرح جائزہ لے لو، پھر میں مزید تفصیل بتاؤں گا کہ ہمیں کس وقت کوٹھی میں داخل ہونا ہے،

کیسے داخل ہونا ہے وغیرہ۔ اس کے بعد ہمارا کام آسان ہوگا، البتہ!'' باس کہتے کہتے رک گیا۔

''البتہ کیا؟'' ان کے منھ سے ایک ساتھ نکلا۔

''اس محلے میں اس کوٹھی سے تین کوٹھیاں چھوڑ کر کرنل خالد کا گھر ہے۔ یہ ریٹائرڈ فوجی ہے اور بے خوابی کا مریض۔ رات کو اسے نیند نہیں آتی اور اکثر یہ کوٹھی سے باہر نکل کر ٹہلنے لگتا ہے۔ اس سارے پروگرام میں بس ایک یہ مسئلہ ہے، لیکن میں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل سوچ لوں گا، پہلے تم کوٹھی کا جائزہ لے لو اور ایک نظر کرنل خالد کی کوٹھی پر بھی ڈال آنا۔ آج کی بات ختم، اب تم جا سکتے ہو۔''

''کیا ہمیں ایک آدھ سوال کرنے کی اجازت ہے باس!'' ثاقب نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں پوچھو۔'' باس نے مسکرا کر کہا۔

''آخر آپ اس حد تک درست معلومات کس طرح حاصل کر لیتے ہیں؟''

''بس! مجھ سے یہی سوال نہ پوچھنا۔ اب جاؤ۔ اس منصوبے پر غور کرو۔ کل ہم ملاقات ہوگی اور اس منصوبے کو آخری شکل دیں گے۔''

یہ کہتے ہی باس کھڑا ہو گیا۔ وہ تینوں بھی فوراً اٹھے۔ انھوں نے سلام کے انداز میں ہاتھ اٹھائے اور باہر نکل گئے۔

اسی شام انھوں نے اپنے حلیوں میں کسی قدر تبدیلی کی اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر شاداب نگر پہنچے۔ یہاں آ کر انھوں نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل ایوان ٹاؤن کی طرف چل پڑے۔ اس کالونی کا انھیں پہلے کسی قدر پتا تھا، اس لیے انھیں کسی سے پوچھنا نہیں پڑا۔ وہ کوٹھیوں کے نمبر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے، آخر انھیں کوٹھی نمبر 40-A نظر آ گئی۔ انھوں نے اس کے گیٹ پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ وہاں دو مسلح پہرے دار تھے۔ وہ کافی فاصلہ رکھ کر گزر رہے تھے کہ کوئی یہ نہ محسوس کرلے کہ وہ خاص طور پر کوٹھی کو دیکھ رہے تھے۔

تین کوٹھیاں چھوڑ کر کرنل خالد کی کوٹھی نظر آئی۔ اس کے دروازے پر کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ کافی آگے تک جا کر وہ واپس آئے اور ایک بار پھر پہلے کرنل خالد کی کوٹھی کے پاس سے گزرے، پھر سیٹھ آثم جلالی کی کوٹھی کے آگے پہنچے۔ دونوں پہرے دار جوں کے توں بس کھڑے نظر آئے۔ انھوں نے کوٹھی کے پچھلی طرف کا رخ کیا، اس سمت سے بھی جائزہ لیا۔ اس طرف ایک کھلا میدان تھا۔ اس میدان میں لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ ان کے پاس جا کھڑے ہوئے، گویا کرکٹ کا کھیل دیکھنے لگے ہوں، اس کے ساتھ ہی وہ کوٹھی کے پچھلے حصے کا جائزہ لے رہے تھے۔

کاشف بولا: ''کیا خیال ہے؟ اس طرف سے داخل ہونا بہت آسان ہوگا۔ پہرے داروں کو کانوں کان پتا نہیں چلے گا اور ہم اپنا کام کر کے واپس آ جائیں گے۔ پہرے داروں کو بے ہوش بھی نہیں کرنا پڑے گا۔''

''سوال تو یہ ہے کہ دیوار تک اور دیوار کے دوسری طرف نیچے کیسے پہنچیں گے؟''

''باس ہی اس بارے میں فیصلہ دیں گے، بلکہ اس پر بھی وہ غور کر چکے ہوں گے۔ ہمیں تو انھوں نے صرف کوٹھی کا جائزہ لینے اور راستوں کو دیکھنے کے لیے بھیجا ہے کہ ہمیں کس راستے سے آنا ہے اور کس راستے سے واپس جانا ہے۔'' شہزاد نے جلدی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ یہ بتانا باس کا کام ہے بلکہ میں تو کہتا ہوں، آنے جانے کا راستہ بھی تو باس ہی بتائیں گے۔ وہ مکمل منصوبہ بناتے ہیں، ہر لحاظ سے مکمل۔''

اور پھر وہ اچھی طرح دیکھ کر واپس آ گئے۔ شام کے وقت باس کے پاس پہنچ گئے۔

''ہاں تو تم دیکھ آئے آثم جلالی کی کوٹھی اور جائزہ لے آئے، کرنل خالد کی کوٹھی کا؟''

''جی ہاں باس! بالکل۔ کوٹھی کے پچھلی طرف کا بھی جائزہ لے آئے۔''

''بس تو پھر اب میں تم لوگوں کو بتاتا ہوں۔ تم اپنی حسن کالونی سے نکل کر مین روڈ پر آؤ

گے۔ تمھارے پاس گاڑی کے کاغذات اور اپنے شناختی کارڈز وغیرہ ہونے چا
کیوں کہ جیل روڈ تک پہنچنے کے لیے تین چوراہے عبور کرنا ہوں گے۔ رات کے
ٹریفک پولیس تمھیں روک سکتی ہے۔ جیل روڈ سے ہو کر تم لوگ سیدھے سیٹھ آثم جلا
کوٹھی کے نزدیک پہنچو گے۔ گاڑی مین روڈ سے اُتار کر ایوان ٹاؤن والے موڑ پر کھڑی
گے۔ یہاں سے تم پیدل کوٹھی کی طرف بڑھو گے۔ نزدیک پہنچنے سے پہلے یہ دیکھ لینا کہ
خالد تو کوٹھی سے باہر نہیں ٹہل رہے، اگر وہ ٹہل رہے ہوں تو تم وہیں دیوار کے ساتھ لگ
انتظار کرو گے۔ وہ پندرہ بیس منٹ ٹہل کر واپس چلے جاتے ہیں اور کچھ دیر بعد پھر آ
ہیں، لیکن اندر داخل ہونے کے لیے یہ پندرہ بیس منٹ تمھارے لیے بہت ہیں۔ ہاں
میں تمھیں ایک مصنوعی پستول دے رہا ہوں۔ اس میں ایک تیر لگا ہوا ہے۔ ٹریگر دبا
تیر نکلے گا۔ تم پہرے داروں میں سے ایک کا نشانہ لو گے۔ تمھارا نشانہ پختہ ہے۔ تیر
سینے پر لگے گا اور ایک پہرے دار فوراً گر جائے گا۔ وہ مکمل بے ہوش ہو چکا ہوگا، کیوں
اس تیر کی نوک پر پن ہے اور اس پن پر بہت تیز اثر کرنے والی دوا لگی ہوئی ہے۔ دو
پہرے دار پہلے اپنے ساتھی کو گرتے دیکھ کر فوراً اس پر جھکے گا۔ اس دوران تم پستول میں
دوسرا تیر چڑھا لو گے اور اس پر وار کرو گے۔ یہ رہا دوسرا تیر۔ خیال رہے، یہ اس وقت ا
پلاسٹک خول میں ہے، تاکہ سوئی پر تمھارا ہاتھ نہ لگ جائے اور پہرے دار کے بجائے کہیں
ہی نہ بے ہوش ہو جاؤ، بلکہ تم دوسرا تیر بھی نکال کر رکھ لو، اسے بھی خول میں رکھ لو۔ خول
نکال کر پستول میں چڑھانے کی دو تین بار میرے سامنے مشق کر لو، اس میں چند سیکنڈ
زیادہ نہیں لگنے چاہییں۔''

''بہت بہتر! تیر پستول سے کیسے نکلے گا؟''

''اس کا اگلا سرا تو پہلے باہر ہے نا! اسے انگلیوں سے پکڑ کر ٹریگر دبا دو۔ تیر باہر نکل

مھاری انگلیوں میں رہ جائے گا۔ چلو، میرے سامنے مشق کرو۔''
انھوں نے تیر نکال کر پستول میں لگایا، پھر نکال کر لگایا۔ کئی بار مشق کرنے کے بعد
ںوں نے دیکھا کہ اس کام میں انھیں صرف پانچ سیکنڈ لگتے ہیں۔

''اب تم گیٹ پر آؤ گے۔ گیٹ کی چابیاں پہرے داروں کی جیب سے مل جائیں گی۔
۔ چابی گیٹ کے تالے کو کھول دے گی اور تم اندر داخل ہو جاؤ گے اور یہ ماسٹر چابیاں
، جو اندر کے دروازوں کے تالے کھول دیں گی۔''

''اور پہرے دار......؟''

''ہاں! دونوں پہرے داروں کو تم اندر گھسیٹ لینا۔ شدید سردی کا موسم ہے۔ لوگ
لحافوں میں دبکے ہوتے ہیں۔ آس پاس کوئی نہیں ہوگا۔ ان دونوں کو اندر گھسیٹتے ہوئے
تمھیں کوئی نہیں دیکھے گا۔ کھٹکا اگر ہے تو کرنل خالد کا۔ اس کی وجہ سے اگر کوئی گڑبڑ ہونے کا
امکان پیدا ہوا تو میں دیکھ لوں گا۔''

''جی...... کیا مطلب؟ آپ دیکھ لیں گے؟''

''ہاں! میں اس جگہ سے نزدیک ہی کہیں موجود ہوں گا اور کرنل خالد کو بے ہوش کرنا
میں ہاتھ کا کھیل ہوگا، یعنی جس طرح تم ان دونوں پہرے داروں کو بے ہوش کرو گے،
اسی طرح میں کرنل خالد کو کر دوں گا، کیوں کہ تم تو اندر جا چکے ہو گے۔''

''بہت خوب! یہ ہوئی نا بات باس!'' وہ خوش ہو کر بولے۔

''اندر کا صفایا کرنا تمھارے لیے کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ کلورو فارم والے رومال
تمھارے پاس موجود ہوں گے۔ تم گھر کے افراد کو بے ہوش کر دینا اور اطمینان سے اپنا کام
کرتے رہنا۔ کام مکمل کر کے تم باہر نکل آنا۔ اس کے بعد اپنی گاڑی میں بیٹھ کر سیدھے اپنے
ہر حسن کالونی پہنچو گے۔ تین دن تک مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کرو گے، بلکہ جب تک میرا فون

نہ آئے، تم گھر میں ہی رہو گے۔ گھر سے باہر بھی نہیں نکلو گے۔ تم یہ سب باتیں سمجھ گئے؟''

''جی بالکل۔''

''اب سنو! تم اس ماہ کی تیرہ تاریخ یعنی آج سے دو دن بعد اپنی مہم انجام دو گے۔ پرسوں چاند کی آخری تاریخ ہے، لہٰذا لوڈ شیڈنگ کے وقت باہر مکمل اندھیرا ہو گا۔ اس اندھیرے میں تمھارا کام اور آسان ہو جائے گا۔ وہاں رات کے وقت لوڈ شیڈنگ کا وقت ایک بجے تا تین بجے ہے، یہی وقت تمھارے کام کا ہو گا۔''

''ہم بالکل سمجھ گئے۔ اب آپ بے فکر ہو جائیں۔''

''شکریہ!'' یہ کہتے ہوئے باس مسکرا دیا۔

○

سیٹھ آثم جلالی اپنی مل کے دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے کہ چپراسی اندر داخل ہوا۔ اس نے ادب سے کہا: ''سیٹھ صاحب! ایک اجنبی شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ آپ اس وقت بہت مصروف ہیں، لیکن اس کا کہنا ہے، وہ بہت دور سے آیا ہے اور خود کو آپ کے گاؤں کا بتاتا ہے۔''

''میرے گاؤں کا؟'' ان کے منھ سے نکلا۔

''جی! اس کا کہنا تو یہی ہے۔''

''اچھا خیر، بھیج دو اسے۔''

''جی بہت بہتر۔''

چپراسی کے کمرے سے نکلتے ہی ایک سیدھا سادا دیہاتی اندر داخل ہوا۔ وہ کرتا اور تہبند پہنے ہوئے تھا۔ سر پر بڑی سی پگڑی تھی۔

''السلام علیکم سیٹھ صاحب!''

''وعلیکم السلام! آؤ بھئی بیٹھو۔'' انھوں نے اسے غور سے دیکھا۔

اس کے کرسی پر بیٹھ جانے کے بعد انھوں نے پوچھا: ''آپ میرے گاؤں کے ہیں؟''

''جی ہاں! ہرشولی کا رہنے والا ہوں۔''

''اوہو اچھا! آپ کا نام کیا ہے؟''

''جی! غلام محمد کھیڑا۔''

''آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے تو بتا دیں، میں حاضر ہوں۔ اپنے گاؤں کے لوگوں کا خیال نہیں کروں گا تو کون کرے گا۔''

''یہی اُمید لے کر آیا ہوں سیٹھ صاحب! میں آپ کو ثبوت کے طور پر یاد دلا دیتا ہوں، ے والد کا نام محمد حسین کھیڑا ہے۔ وہ آپ کے والد کے مزارع تھے۔ آپ کی زمینیں ولی کے تیسرے حصے پر محیط تھیں، یعنی گاؤں کا صرف ایک چوتھائی دوسروں کا تھا اور تین ھائی آپ کے والد کا۔''

''یہ معلومات بالکل درست ہیں۔ مجھے یقین ہے، آپ میرے گاؤں کے ہیں۔ آپ ج دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائیں اور جس کام سے آئے ہیں، وہ بھی بتا دیں۔''

''میری والدہ زندہ ہیں، مجھے انھوں نے ہی یہاں آنے پر مجبور کیا ہے، ورنہ خود میں تو سے بہت ہچکچا رہا تھا۔ میری تین جوان بہنیں ہیں۔ ان کی شادی کا مسئلہ ہے۔ آج کل ی گھر سے جہیز ملتا نظر نہ آئے تو لوگ اس گھر سے رشتہ نہیں مانگتے، لیکن سیٹھ صاحب! اگر پ ناگواری محسوس کریں تو میں معافی چاہوں گا۔ آپ کوئی خیال نہ کیجیے گا۔'' یہ کہتے وقت ی آواز بہت بھاری ہو گئی۔

''غلام محمد! پہلی بات تو یہ کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس قدر دولت دی ہے کہ سنبھالے نہیں ی۔ ہر طرح سے بے فکری ہے۔ ان حالات میں اگر آپ جیسے بھائیوں کی مدد کر دوں تو یہ

میرے لیے خوشی کی بات ہے، لیکن میری شرط ایک ہے اور وہ یہ کہ آپ آج دوپہر کا کھانا میر
ساتھ کھائیں گے، وہ بھی یہاں نہیں، میرے گھر چل کر۔ میں اپنے بچوں سے آپ کو ملواؤں
بیگم کو بتاؤں گا، وہ بھی تو ہرشولی کی ہی ہیں، میرے چچا کی بیٹی، انھیں بھی بہت خوشی ہوگی۔"

"آپ کو زحمت ہوگی۔"

"زحمت نہیں، خوشی۔" وہ مسکرا دیے، پھر بولے: "آپ کچھ دیر میرے کمرے
آرام کرلیں، پھر ہم گھر چلیں گے۔" انھوں نے اندرونی کمرے کے دروازے کی طر
اشارہ کیا، وہ ڈرے ڈرے سے انداز میں اس کمرے میں چلا آیا۔ اندر کے ٹھاٹ با
دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ پورا کمرا قیمتی ترین چیزوں سے سجا تھا۔ دیواروں پر
بھاری فریم والی تصاویر لگی تھیں۔ آتش دان پر چند چھوٹی چھوٹی چیزیں نظر آئیں۔ یہ
سجاوٹ کی چیزیں تھیں۔ وہ انھیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ان
سے ایک ایک چیز بیس بیس پچیس پچیس ہزار کی ہو اور وہ چیزیں تھیں بھی ایسی کہ جیبوں
آسانی سے رکھی جاسکتی تھیں، مثلاً ان میں سے ایک تو بالکل کلائی کی گھڑی جیسی چیز تھی۔
کے گرد سنہری فریم تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ فریم سونے کا ہو۔ چائے کا ایک کپ نظر آ
جونہی اس نے اس کپ کو اُٹھایا، اس کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اس
اس کپ کو واپس رکھا تو اس کا رنگ پہلے والا ہوگیا۔ اس نے اسے کئی بار اُٹھایا اور ر
ہر بار ایسا ہی ہوا۔ ایک سنہری رنگ کی انگوٹھی نظر آئی، اس نے انگوٹھی ہاتھ میں لی تو اس
سے آواز آنے لگی۔ انگوٹھی کو کان سے لگایا تو وہ باتیں کرتی سنائی دی۔ وہ کہہ رہی

"آپ کون ہیں؟ آپ کوئی اجنبی ہیں تو مجھے وہیں رکھ دیں۔"

اس نے جلدی سے انگوٹھی وہیں رکھ دی، پھر اٹھائی تو پھر یہی آواز سنائی دی، وہ
طرح کمرے کی چیزوں میں گم رہا، یہاں تک کہ سیٹھ آشم جلالی اندر داخل ہوئے۔

"کیا ہو رہا ہے؟" سیٹھ صاحب مسکرائے۔

"وہ سیٹھ صاحب! میں یہ چیزیں دیکھنے لگ گیا تھا، حیرت انگیز چیزیں ہیں یہ تو۔"

"لیکن یہ تمام چیزیں بے مقصد نہیں۔ یہ سب کام کی چیزیں ہیں، جس انگوٹھی کو آپ
اُٹھایا تھا، اس سے موسم کی تبدیلی وقت سے پہلے معلوم ہو جاتی ہے، گویا یہ چلتا پھرتا
موسمیات ہے۔"

"اوہ۔" مارے حیرت کے اس کے منھ سے نکلا۔

"اسی طرح یہ جو گھڑی ہے، اس میں پوری دنیا کے اوقات دیکھے جا سکتے ہیں، مثلاً ہم
سکتے ہیں کہ سعودی عرب میں اس وقت کیا ٹائم ہوا ہے، وغیرہ، جو کپ آپ نے اٹھایا
جس کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے، یہ کمرے کا درجہ حرارت بتاتا ہے۔ اس کے کچھ اور بھی
ے ہیں۔ کیا اب ہم چلیں؟"

"جی ضرور...... کیوں نہیں۔"

سیٹھ صاحب اسے ساتھ لیے باہر نکلے، باہر ان کی کار بالکل تیار تھی۔ ڈرائیور کار سے
چوکس کھڑا نظر آیا۔ کار کے بائیں طرف لوگوں کی ایک لمبی قطار لگی نظر آئی۔ ان سب کی
ںوں میں امید کے دیے جگ مگ جگ مگ کرتے نظر آئے۔

"ذرا میں ان لوگوں سے فارغ ہولوں۔" انھوں نے غلام محمد سے کہا۔

اسے کیا پتا تھا، ان لوگوں سے سیٹھ صاحب کیسے فارغ ہوں گے۔ وہ سر ہلا کر رہ گیا اور
صاحب ان کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے ہاتھ میں اب نوٹوں کی کئی گڈیاں نظر آ رہی
، وہ انھوں نے اسی وقت جیب سے نکالی تھیں۔ انھوں نے ان لوگوں میں نوٹ تقسیم
نے شروع کیے۔ ہر کوئی آگے بڑھ کر نوٹ لیتا اور انھیں سلام کرکے پیچھے ہٹتا رہا۔ یہاں
کہ لائن ختم ہوگئی۔ گویا جتنے لوگ آئے تھے، سبھی کو نوٹ مل گئے۔ اب وہ اس سے

بولے: ''آئیے اب چلیں۔''

''یہ! یہ مل ملازم ہیں۔''

''ارے نہیں! یہ تو بے چارے عام ضرورت مند ہیں۔''

''اور کیا یہ آپ کا روز کا معمول ہے۔''

''بس یہی سمجھ لیں۔''

وہ دل ہی دل میں حیران ہوتا رہا اور ان کی تعریف کرتا رہا۔ ادھر ڈرائیور گاڑی
دروازہ کھول چکا تھا۔

''بیٹھیے غلام محمد صاحب!''

دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تو ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔ گاڑی
پُرسکون انداز میں چلی۔ مل کی سڑک کے دونوں طرف لوگ جلدی جلدی سلام کے
ہاتھ اُٹھاتے نظر آئے۔ سب لوگوں کے چہروں پر جوش تھا، خوشی تھی۔ یوں لگتا تھا، جیسے
سب سیٹھ آثم جلالی سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔

''بہت خوش نظر آرہے ہیں یہ لوگ۔''

''ہاں! میں ان کا اپنا ہوں۔ یہ میرے اپنے ہیں۔ ہم خوش کیوں نہ نظر آئیں۔ یہ
پر جان چھڑکتے ہیں۔ میں بھی ان کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہوں
نہ یہ مجھے غیر سمجھتے ہیں، نہ میں انھیں۔ میں نے مل میں ان کے لیے اسپتال بنوایا ہے۔ وہاں
ان سب کا ان کے بیوی بچوں سمیت مفت علاج ہوتا ہے۔ مفت دوائیں ملتی ہیں۔ پہننے
لیے یہ اپنی پسند کا کپڑا لے سکتے ہیں، پورے گھرانے کے لیے، کوئی پابندی نہیں، کوئی
روک ٹوک نہیں۔ اسی طرح انھیں زندگی کی دوسری تمام ضروریات مل کی دکانوں سے
کم نرخوں پر ملتی ہیں۔ میں نے یہاں باقاعدہ ایک مارکیٹ بنائی ہے، یعنی مل کا بازار ہے

اپنی رہائشی کالونی ہے۔ انھیں کرایہ نہیں دینا پڑتا۔ کوئی شخص بوڑھا ہو جاتا ہے، ریٹائر
ہے تو اس کی اولاد کو ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ پنشن الگ دی جاتی ہے۔ غرض میری مل
الحمدللہ سبھی ملازمین بہت خوش ہیں۔ وہ بہت مطمئن ہیں۔ دن رات مجھے دعائیں دیتے
میں انھیں دعائیں دیتا ہوں۔ نتیجہ یہ کہ پورے ملک میں ہماری مل کا کپڑا بہت مقبول
یہ سب اللہ کی مہربانی ہے۔''

''یہ سب سن کر بہت خوشی محسوس کر رہا ہوں۔''

''آپ بھی چاہیں تو گاؤں سے یہاں آجائیں۔''

''ماں کا مسئلہ ہے۔ ماں گاؤں سے باہر نکلنے پر تیار نہیں۔''

''کوئی بات نہیں، بلکہ یہ اور اچھا ہے۔''

وہ مل کے باہر نکل آئے۔ اب بھی ڈرائیور نہایت مناسب رفتار سے کار چلا رہا تھا۔
لگتا تھا جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو۔ سیٹھ آثم جلالی بھی پُرسکون تھے۔ اس کا مطلب تھا،
وہ اسی رفتار سے کار کا سفر پسند کرتے تھے۔

آخر ایک کوٹھی کے سامنے رکی۔ گیٹ پر دو مسلح پہرے دار نظر آئے۔

دونوں پہرے داروں نے پہلے تو ادب سے سیٹھ صاحب کو سلام کیا، پھر جلدی سے
گیٹ کھول دیا۔

ڈرائیور کار اندر لے گیا۔ پہرے داروں نے گیٹ بند کر دیا۔ ڈرائیور نے گاڑی
ل کے سائبان کے نیچے روک دی، پھر نیچے اتر کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ سیٹھ صاحب
نے غلام محمد سے کہا: ''آؤ غلام محمد!''

اب دونوں اندر کی طرف چلے۔ جونہی انھوں نے برآمدے میں قدم رکھا، سامنے
والے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک خاتون اپنے تین بچوں کے ساتھ باہر آگئیں۔

''السلام علیکم میاں صاحب!'' خاتون نے نہایت ادب کے انداز میں کہا۔

''السلام علیکم بابا جانی!'' تینوں بچے بھی اسی باادب انداز میں بولے۔

''وعلیکم السلام بیگم اور بچو!''

''اور یہ، آپ کے ساتھ!'' بیگم کہتے کہتے رک گئیں۔

''پہچانو تو مانیں۔'' سیٹھ آثم جلالی مسکرائے۔

''کیا مطلب؟''

''ہمارے گاؤں ہرشولی کے ہیں۔ اتنا میں نے بتا دیا، آگے بتانا آپ کا کام۔''

''اوہ اچھا، ٹھیک ہے۔ آپ بتانے میں جلدی نہ کیجیے گا۔'' وہ بولیں۔

''چلیے، نہیں کرتا جلدی۔'' سیٹھ صاحب مسکرائے۔

بیگم جلالی چند لمحے تک غور سے دیکھتی رہیں، پھر اچانک بولیں: ''آہا! یہ ضرور محمد ... کے بیٹے غلام محمد ہیں۔''

''واہ بیگم! خوب پہچانا۔''

''اور پہچانتی کیوں نہ، بچپن میں ان کے والد کو اکثر دیکھتی رہی ہوں اور ان کی ... بالکل ان سے ملتی جلتی ہے۔''

''یہی بات ہے بیگم! خوشی ہوئی۔''

''لیکن یہ آپ کو کہاں مل گئے؟''

سیٹھ آثم جلالی انھیں تفصیل سنانے لگے، پھر وہ سب ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ ... سات کمروں میں سے سامنے والا کمرہ ڈرائنگ روم تھا۔ وہ گاؤں کی، گاؤں کے لوگوں ... باتیں کرتے رہے، یادیں تازہ کرتے رہے، اتنے میں دوپہر کا کھانا لگ گیا۔ سب ... ساتھ کھانا کھایا۔ سب لوگ غلام محمد سے بار بار کہتے رہے: ''یہ لیں نا غلام محمد! بھائی یہ ... ہیں۔ انکل یہ فرنی بھی لیں۔''

وہ بے چارہ جی بس بہت کھا چکا ہوں، وہ کہتا رہا۔ آخر کھانے کا دور ختم ہوا۔ تب غلام ... نے کہا: ''میں اب اجازت چاہوں گا۔''

''کیا! یہ کیسے ہو سکتا ہے، ابھی تو آپ آئے ہیں۔ نہیں نہیں، آج رات کو آپ یہیں ... گے۔ بے شک کل بھی ٹھیریں اور پرسوں چلے جائیں۔''

''یہ...... یہ میرے لیے بہت مشکل ہے۔ کم از کم کل تو مجھے لازمی جانا ہو گا۔''

''اچھا خیر، آج رات تو یہاں ٹھیرنا پڑ رہا۔'' سیٹھ آثم جلالی نے خوش ہو کر کہا۔

○

اس رات غلام محمد کے لیے بہت پُرتکلف کھانا تیار کرایا گیا۔ اس کے لیے تو یہاں کا ... کھانا بھی بہت پُرتکلف تھا۔ رات کو تو پھر حد ہو گئی۔ اسے مجبوراً تمام چیزیں کھانا پڑیں، ... تک کہ مزید کوئی چیز کھانے کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے اس قدر ڈٹ کر زندگی میں کبھی ... کھایا تھا۔ وہ تو بھوک رکھ کر کھانے کا عادی تھا۔ بچپن میں ہی اس نے نبی کریم صلی اللہ ... وسلم کی یہ حدیث سن لی تھی کہ کھانا بھوک رکھ کر کھاؤ، لیکن آج وہ اس اصول کو بہت پیچھے ... گیا تھا۔ کچھ دیر اور گپ شپ جاری رہی، پھر سونے کے لیے اسے ڈرائنگ روم کے ... والا کمرا دیا گیا۔ ڈرائنگ روم کے دوسری طرف والا کمرا سیٹھ آثم جلالی اور ان کی ... تھا اور اسی طرح اس کے بعد والے تین کمرے بچوں کے تھے۔ دو پہرے داروں کے ... گیٹ کے ساتھ ہی کمرا تھا۔

... سب لوگ سونے کے لیے اُٹھ گئے تھے، لیکن غلام محمد کی آنکھوں سے نیند بہت دور تھی ... کے پیٹ میں عجیب وغریب سی گڑگڑ ہو رہی تھی، بدذائقہ ڈکاریں آ رہی تھیں۔ ہر ڈکار ... کا منھ بُرا بن جاتا اور اس پر جھنجلاہٹ طاری ہو جاتی۔ وہ سوچ رہا تھا، آج یہ اس سے

کیا غلطی ہوگئی، کیوں وہ اتنا کھا گیا، لیکن اس میں اس کا قصور نہیں تھا۔ قصور تو نہ سیٹھ صاحب اور ان کے گھر والوں کا بھی نہیں تھا، بس ایسا سب کچھ محبت میں ہوا تھا۔ رات گئے تک وہ کروٹیں بدلتا رہا، اچانک اس کے کانوں میں ایک عجیب سی آواز آئی، جیسے کوئی اوپر سے گرا ہوا۔ اس کے کان بہت تیز تھے، لہٰذا یہ آواز اس کے کانوں کا دھوکا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں اور بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

O

''یہ کیا بھئی، ایک بج گیا اور لائٹ نہیں گئی۔ یہ لوڈ شیڈنگ والے آج کہیں بھول تو نہیں گئے، بے وقوف کہیں کے۔'' کاشف نے منھ بنا کر کہا۔

''کوئی بات نہیں، چند منٹ انتظار کر لیتے ہیں۔ ہو جائے گی لائٹ آف۔'' شہزاد نے کہا۔

''لیکن اس طرح تو پورا پروگرام متاثر ہو سکتا ہے۔ وقت کا تو ہمیں خاص خیال رکھنا ہے۔''

''اب یہ مجبوری پیش آگئی ہے نا۔'' ثاقب نے کہا۔

''خیر۔'' کاشف کندھے اچکا کر رہ گیا۔

وہ اس وقت ایک کونے میں کھڑے تھے۔ یہ جگہ سیٹھ آثم جلالی کے گھر سے کچھ فاصلے پر تھی، لیکن یہاں سے کوٹھی کا گیٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ دونوں پہرے دار چوکس کھڑے تھے۔ پھر تین منٹ اور گزر گئے، لیکن لائٹ نہ گئی، شاید لوڈ شیڈنگ کا وقت تبدیل کر دیا گیا تھا۔

''اب ہم نہیں رک سکتے، ورنہ منصوبہ ناکام ہو جائے گا اور ایسا آج تک نہیں ہوا۔ ہمیں اب اپنا کام روشنی میں ہی کرنا ہوگا۔ شدید سردی ہے۔ دور دور تک کوئی نہیں ہے، ڈر کی کیا بات ہے، آؤ۔'' کاشف نے دبی آواز میں کہا۔

''اچھی بات ہے۔ منصوبے پر عمل تو کرنا ہوگا، ورنہ باس تو ہمیں جان سے مار دے گا۔ یوں بھی وہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہے۔'' ثاقب بڑبڑایا۔

پھر وہ آگے بڑھے۔ دیوار کے ساتھ لگے سرکتے رہے۔ یہاں تک کہ اتنے فاصلے پر آ گئے کہ پہرے داروں کو نشانہ بنا سکیں۔ کاشف نے تیر والا خول نکالا۔ اسے کھولا، اس میں سے تیر نکالا اور پستول میں لگا لیا۔

''تم دوسرا تیر نکال کر ہاتھ میں لے لو، تاکہ زیادہ وقت نہ ضائع ہو۔''

''ٹھیک ہے۔'' ثاقب نے کہا اور خول کھول کر تیر نکال لیا۔

اب کاشف نے نشانہ لیا۔ تینوں نے دم سادھ لیے، پھر کاشف نے ٹریگر دبا دیا۔ تیر ایک پہرے دار کے سینے میں جا کر پیوست ہو گیا۔ اس کے منھ سے ایک ہلکی سی کراہ نکل گئی، اور وہ تیورا کر گرا۔

''کیا ہوا؟'' دوسرے پہرے دار کے منھ سے مارے حیرت کے نکلا اور پھر بے ساختہ اس پر جھک گیا۔ ادھر کاشف نے پھر ٹریگر دبا دیا۔ یہ تیر دوسرے پہرے دار کی کمر میں لگا۔ اس کے منھ سے بھی کراہ نکل گئی۔ وہ بھی گرا اور ساکت ہو گیا۔

تینوں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ میدان صاف نظر آیا۔ وہ تیزی سے، لیکن آواز پیدا کیے بغیر لپکے، پہرے داروں کی جیبوں کو ٹٹولا۔ چابیاں مل گئیں۔ جلدی جلدی ان کو تالے کے سوراخ میں لگانے لگے۔ آخر ایک چابی لگ گئی۔ کلک کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ اب تینوں نے مل کر پہلے ایک پہرے دار کو اندر گھسیٹا، پھر دوسرے کو اور گیٹ بند کر دیا، تینوں کا سانس قدرے پھول گیا تھا۔ کاشف نے سرگوشی کی: ''پہلا مرحلہ طے ہو گیا۔''

ثاقب اور شہزاد نے سر ہلا دیا۔ ان کے قدم ڈرائنگ روم سے دائیں طرف اٹھ گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ سیٹھ صاحب بالکل سامنے والے کمرے کے دوسری طرف والے کمرے میں سوتے ہیں اور ان سے اگلے تین کمرے بچوں کے تھے۔

وہ سیٹھ آثم جلالی کے کمرے کے دروازے پر جٹ گئے۔ صرف ۳۰ سیکنڈ بعد وہ تالا

کھول چکے تھے۔ انھوں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔

کمرے میں سیٹھ آثم جلالی اور ان کی بیگم گہری نیند میں نظر آئے۔ کاشف نے اندر [illegible] جیب میں سے ایک رومال نکالا۔ اس پر بے ہوشی کی دوا لگی تھی۔ وہ ان دونوں کی طرف بڑھا ہی تھا کہ آتش دان پر رکھے بھالو نے تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ آواز اس قدر تیز [illegible] کہ وہ بری طرح اچھل پڑے۔ ساتھ ہی سیٹھ صاحب اور ان کی بیگم بوکھلا کر بستر پر اٹھ [illegible] اور ادھر ان تینوں کے ہاتھوں میں پستول نظر آئے۔

''خبردار! حرکت نہ کرنا۔'' کاشف غرایا۔

سیٹھ آثم جلالی اور ان کی بیگم ساکت رہ گئے۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ شاید انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سیٹھ آثم جلالی بس اتنا کہہ سکے: ''ک...... کیا مطلب؟''

''بس خاموش رہیں۔ شہزاد! برابر والے کمروں سے ان کے تینوں بچوں کو بھی یہیں لے آؤ، تاکہ ہم بے فکری سے اپنا کام کر سکیں۔ ویسے سیٹھ صاحب! یہ بھالو کیا بلا ہے، یہ کیسے بجنے لگا تھا؟''

''کوئی اس کے پاس سے گزرتا ہے تو یہ تالی بجانے لگتا ہے۔ آج کے دور میں ایسے دروازے موجود ہیں جو کسی انسان کے قریب آنے پر خود بخود کھل جاتے ہیں۔ یہ اسی قسم کا بھالو ہے۔''

''اوہ!''

''بس یہ بھالو ایسا ہی ہے، لیکن میں نے یہ اس نیت سے نہیں خریدا تھا کہ یہ ہمیں چوروں کی آمد پر خبردار کر دے گا، یہ تو بس یوں سمجھ لو کہ اللہ کی مہربانی سے ایسا ہو گیا۔ پھر اللہ نے اسی دن کے لیے خریدنے کا خیال میرے دل میں ڈالا ہو گا۔ انسان کو پتا نہیں ہوتا، لیکن قدرت اپنا کام کرتی رہتی ہے، ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ایک انسان کے [illegible]

[illegible] ہی اس کے لیے وہ سامان تیار ہونا شروع ہو جاتا ہے، یا اس کے سامان بنتے چلے [illegible] ہیں، جس کی اسے زندگی میں ضرورت پڑتی ہے۔''

''اتنا لمبا جواب دینے کے لیے کس نے کہا تھا آپ سے۔'' ثاقب نے منھ بنایا۔

''اوہ مجھے افسوس ہے۔ میں بھول گیا تھا کہ ہم اس وقت ڈاکوؤں کے درمیان ہیں۔''

اسی وقت شہزاد پستول ہاتھ میں لیے کمرے سے نکل گیا۔ کوئی پانچ منٹ بعد وہ واپس [illegible] تینوں بچے اس کے ساتھ تھے۔ ان کے چہرے دھواں ہو رہے تھے۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں بچو! یہ ڈاکو ہیں۔ مال اور دولت چرا لے جائیں گے اور [illegible] اللہ تعالیٰ نے ہمیں اتنا کچھ دیا ہے، لہٰذا فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''عقل مند ہو سیٹھ!'' شہزاد ہنسا۔

''ہمارے پروگرام میں قدرے گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ہمیں تو انھیں سوتے میں لوٹنا تھا، لیکن [illegible] جاگ گئے۔ خیر، سیٹھ صاحب! آپ ایسا کریں، تجوری خود کھول دیں۔ اگر تجوری کھولتے [illegible] آپ نے کوئی چالاکی دکھائی تو آپ میں سے کوئی زندہ سلامت نہیں بچے گا۔ مال و دولت [illegible] خاطر آپ کیوں جانیں دیں گے بھلا!''

''ٹھیک ہے! میں تجوری کھول دیتا ہوں۔''

انھوں نے میز کی دراز کو کھولا، اس میں سے چابیاں نکالیں اور تجوری کھول ڈالی۔

''اس کے خفیہ خانے بھی کھول دیں اور یاد رکھیے! اگر کوئی خفیہ الارم کسی دوسری جگہ [illegible] پولیس اسٹیشن وغیرہ میں بجا اور وہاں سے پولیس نے ادھر کا رخ کیا تو آپ لوگ [illegible] ہاتھوں مارے جائیں گے، خیال رہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہو گی، میں کہہ چکا ہوں کہ مال و دولت کی خاطر میں اپنے اور [illegible] بال بچوں کی زندگیوں کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا، لہٰذا خفیہ خانے بھی کھول رہا

ہوں۔''

''بہت خوب! کاشف اور شہزادا! تم مال تھیلوں میں بھرلو۔ میں ان کا دھیان

گا۔'' ثاقب نے ان سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

انھوں نے نہایت تیزی سے مال سمیٹنا شروع کر دیا۔ ثاقب پستول تانے کھڑا
سیٹھ آثم جلالی کے چہرے پر پریشانی کے آثار نہیں تھے، کیوں کہ ان کی زندگیوں کو
خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا، صرف دولت ہاتھ سے جا رہی تھی۔

انھوں نے تجوری خالی کرنے میں صرف دس منٹ لگائے، پھر وہ ان کی طرف مڑ
اس وقت ثاقب نے کہا: ''معاف کیجیے گا سیٹھ صاحب! ہمارا اصول تو نہیں کہ ڈا
واردات میں کسی کا خون بہائیں، لیکن آج ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے ثا
لہجہ سرد ہو گیا۔

''کیا مطلب؟'' وہ چونک اٹھے۔

''ہمارا جو پروگرام تھا، معاملہ اس کے مطابق نہیں نمٹا۔ آپ لوگ سوئے رہتے تو ا
مال سمیٹ کر چپ چاپ چلے جاتے، لیکن اس بھالو نے کام خراب کر دیا۔ نہ یہ تالی
نہ آپ جاگتے۔ اب آپ نے ہمیں دیکھ لیا ہے، لہٰذا ہم آپ کو زندہ نہیں چھوڑ سکتے، کیو
پولیس آپ سے ہمارے حلیے پوچھے گی تو آپ فوراً بتا دیں گے، پھر پولیس ہمارے
اخبارات میں دے گی۔ اس طرح ہماری گرفتاری عمل میں آ سکتی ہے، اس لیے......
کہتے ہوئے اس کا پستول ان چاروں کی طرف تن گیا۔

''نن نہیں...... یہ ظلم نہ کرو۔ میری بات سنو۔ ہم تمھارے حلیے کسی کو نہیں بتائیں
حلیے بتانے کی ضرورت تو تب پیش آئے گی نا جب ہم چوری کی رپورٹ درج کرا

...ہم رپورٹ درج نہیں کرائیں گے، یہ میرا وعدہ ہے۔'' سیٹھ آثم جلالی نے درد
بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں سیٹھ صاحب! یہ اس وقت کی باتیں ہیں۔ جب ہم چلے جائیں گے، اس وقت
آپ کے خیالات اور ہوں گے، ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے۔''

اس کا ہاتھ اور تن گیا، پھر اس کے ہونٹ ہلے: ''خدا حافظ سیٹھ صاحب! اللہ آپ کی
آپ کے بال بچوں کی آخرت اچھی کرے۔''

''نن...... نہیں...... نہیں...... رک جاؤ...... میری بات مان لو۔ ہمارے فائدے
کی بات......!''

عین اس لمحے ثاقب کے سر پر کوئی چیز زور سے لگی۔ اس کے ساتھ ہی کاشف اور شہزادا اچھل
ادھر اُدھر ہو گئے اور کمرے میں داخل ہو کر ثاقب کے سر پر وار کرنے والے پر ٹوٹ پڑے۔

اب انھوں نے دیکھا، کھلے دروازے سے دبے پاؤں اندر داخل ہونے والا ان کا
دیہاتی مہمان غلام محمد تھا۔ اس نے کرکٹ کے بیٹ سے ثاقب کے سر پر وار کیا تھا، لیکن اس
سے پہلے کہ وہ کاشف اور شہزادا پر بیٹ برسا سکتا، وہ دونوں خطرے کو بھانپ کر پہلے ہی اس
سے ٹکرا گئے تھے اور جونہی وہ اس سے ٹکرائے، بیٹ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

ثاقب کے سر پر چوٹ گہری آئی تھی۔ اس کے سر سے خون نکلتا نظر آ رہا تھا، وہ دونوں
ہاتھوں سے سر تھامے اکڑوں بیٹھا تھا۔ پستول چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا، لیکن اس کے نزدیک
ہی پڑا تھا۔

ادھر وہ دونوں غلام محمد پر قابو پانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے، وہ تھا دیہات کا
پلا ہوا، مضبوط ہاتھ پیر کا مالک، وہ ان دونوں کے قابو میں نہیں آ رہا تھا، الٹا ان دونوں کو قابو
کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ ایسے میں کاشف چلایا: ''ثاقب! ہمت کرو۔ یہ بیٹ

اٹھا کر اس دیہاتی کے سر پر دے مارو، یہ ہمارے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔''

یہ جملے ثاقب کی سماعت سے ٹکرائے۔ اس نے سر کو دو تین جھٹکے دیے، تھر تھر کانپتا ہا[illegible] پستول کی طرف بڑھایا۔ عین اس وقت سیٹھ آثم جلالی کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ ان کا سوتا [illegible] ذہن جاگ اٹھا۔ وہ بلا کی تیزی سے جھپٹ پڑے اور پستول اٹھا لیا۔

غلام محمد چلّایا: ''سیٹھ صاحب! پستول اس زخمی کے سر پر ماریں، تاکہ یہ مکمل بے [illegible] ہو جائے۔''

''ن نہیں...... مم...... میں...... میں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا۔''

''غلام محمد نے چیخ کر کہا: ''سیٹھ صاحب! یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اگر انھوں نے ہم پر قابو پا لیا تو ہم میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔''

''تت...... تو کیا...... میں۔''

''ہاں ہاں...... دے ماریں پستول۔ یہ قاتل ہیں، ڈاکو ہیں۔ ان پر رحم کیا کرنا۔''

اور پھر سیٹھ ہمدانی نے پستول کی نال پکڑ لی، ہاتھ سر کے اوپر اٹھایا اور ثاقب کے سر [illegible] پستول کا دستہ دے مارا۔ دستہ اس کے زخم پر لگا۔ اس کے منھ سے چیخ نکل گئی۔

''ایک وار اور۔'' غلام محمد چلّایا۔

''کک...... کیا یہ کافی نہیں؟''

''نہیں، ایک اور۔''

انھوں نے ایک وار اور کیا اور ثاقب لمبا لیٹ گیا۔

''اب یہ بیٹ اٹھا لیں اور ان کے سروں پر بجا دیں، لیکن خیال رہے، کہیں میر[illegible] پر نہ مار دیجیے گا۔'' غلام محمد مشکل سے بولا۔

اسے ان دونوں کے خلاف زبردست جدوجہد کرنی پڑ رہی تھی۔ اس وقت ان دونو[illegible]

[illegible]دنیں اس نے اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ رکھی تھیں، جب کہ وہ دونوں اس پر مکے [illegible]ر رہے تھے، یہ مکے اس کی کمر اور پیٹ میں لگ رہے تھے اور ہر بار اس کے منھ سے [illegible]ف وہ آوازیں نکل رہی تھیں۔

سیٹھ صاحب نے بیٹ اٹھا لیا اور اسے سر سے بلند کر کے ناپ تول کر ان میں سے ایک [illegible] پر دے مارا۔ بیٹ ٹھیک سر پر لگا۔

''ایک اور۔'' غلام محمد چلّایا۔

انھوں نے ایک بیٹ اور دے مارا۔ پھر دوسرے کی طرف مڑے۔ اس کے سر پر بھی [illegible] بیٹ بجا دیے ان کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ غلام محمد کو مسلسل لگنے والے مکے رک گئے۔

''اللہ کا شکر ہے، ان مکوں سے تو نجات ملی، ویسے سیٹھ صاحب! احتیاط اس میں ہے [illegible]ک ایک بیٹ اور دے ماریں۔''

''دیکھ لو غلام محمد! کہیں یہ مر ہی نہ جائیں۔ زخمی تو یہ کافی ہو چکے ہیں۔''

''بے فکری ہو جائے گی سیٹھ صاحب! ابھی ہمیں پولیس کا انتظار بھی تو کرنا پڑے گا۔ وہ [illegible]ں سا فون کرتے ہی آ جائے گی۔''

''میں فون کر چکی ہوں۔'' بیگم صاحبہ کی آواز سنائی دی۔

''پھر بھی، جلد نہیں آ جائیں گے۔''

''اچھی بات ہے۔''

اور پھر سیٹھ صاحب نے ایک ایک بیٹ ان کے اور رسید کر دیا۔ غلام محمد نے ان دونوں [illegible]وڑ دیا، وہ درخت کٹے ہوئے تنوں کی طرح فرش پر آ رہے۔

''اُف مالک! یہ سب کیا تھا! یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہوں۔''

[illegible]ثم جلالی بڑبڑائیں۔

''اور غلام محمد! آپ کیسے جاگ گئے؟''

''میں سویا ہی کب تھا۔ مجھے تو نیند آئی نہیں، پیٹ میں گڑبڑ تھی، جب انھوں نے پہرے داروں کو بے ہوش کیا اور وہ گرے تو ان کے گرنے کی آواز میں نے سن لی تھی۔''

''اوہ! تو انھوں نے پہرے داروں کو بے ہوش کر دیا ہے۔''

''جی ہاں! ورنہ یہ اندر کیسے آسکتے تھے۔''

''اللہ نے اپنا کرم فرمایا۔''

''سچ بتاؤں سیٹھ صاحب!''

''کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''یہ جو آپ صدقہ خیرات دل کھول کر کرتے رہتے ہیں نا اور ہم جیسے غریبوں کی مدد کرتے رہتے ہیں نا، تو اللہ تعالیٰ بھی آپ کی مدد کرتا ہے۔ یہ اس وقت اللہ کی مدد نہیں تھی تو اور کیا تھا، اللہ ہی کا تو کام تھا کہ میں ضرورت سے زیادہ کھا گیا، پیٹ میں گڑبڑ کی وجہ سے......!''

''خبردار! تم سب ہاتھ اوپر اٹھا دو، سب صدقہ خیرات ابھی نکل جائے گا۔'' انھوں نے ایک خوف ناک آواز سنی۔

وہ بری طرح اچھلے۔ ان کے رنگ اڑ گئے۔ ایک لمبا چوڑا، خوف ناک شکل صورت والا آدمی ان پر کلاشن کوف تانے نظر آیا۔ وہ ساکت رہ گئے۔

O

''بب ــــ بب باس!'' ثاقب کے منھ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

اس کا مطلب ہے، وہ مکمل طور پر بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ باس کی آواز سن کر کاشف اور شہزاد کے جسموں میں بھی حرکت ہوئی۔

انھوں نے بہت مشکل سے کہا: ''بب...... باس! آپ...... آپ!''

''ہاں! یہ میں ہوں، لیکن مجھے افسوس ہے۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ پولیس کسی لمحے یہاں آسکتی ہے اور تم لوگوں کی حالت اس قابل نہیں کہ میرے ساتھ فرار ہو سکو۔ میں تمھیں گھسیٹ کر گاڑی تک لے جاؤں تو اس میں بہت دیر لگ جائے گی اور تمھارے ساتھ میں بھی مارا جاؤں گا، لہٰذا دوستو! خدا حافظ۔ یہ میری تم سے آخری ملاقات ہے۔ میں تم کو ختم کر کے جا رہا ہوں، زندہ چھوڑ کر گیا تو پولیس تم لوگوں کے ذریعے سے مجھ تک پہنچ جائے گی۔ لہٰذا، خدا حافظ۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے کلاشن کوف پوری طرح ان کی طرف تان دی۔ ان کے منھ سے خوف کے عالم میں نکلا: ''نن...... نہیں...... نہیں۔''

عین اس لمحے باس اوندھے منھ گرا۔ اس کے منھ سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ کوئی بہت بھاری اور سخت چیز اس کی ریڑھ کی ہڈی پر لگی تھی۔

انھوں نے چونک کر دیکھا، کرنل صاحب ہاتھ میں لوہے کا وہ مگدر لیے کھڑے تھے، جس سے وہ ورزش کیا کرتے تھے۔

''اس دیہاتی نے ٹھیک کہا سیٹھ صاحب! یہ ساری برکت اس صدقہ اور خیرات کی ہے جو آپ کثرت سے کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صدقہ بلاؤں کو ٹالتا ہے اور یہ ڈاکو بھی آخر بلائیں تھیں۔''

''اور...... اور آپ کیسے پہنچ گئے؟'' سیٹھ صاحب مارے حیرت کے بولے۔

''مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ ابھی چند منٹ پہلے میں ٹہلنے کے لیے باہر نکلا تو آپ کے پہرے دار نظر نہ آئے اور یہ بات بہت حیرت کی تھی، کیوں کہ ایسا تو آج تک نہیں ہوا تھا۔ میں جب بھی نکلتا تھا، وہ کھڑے نظر آتے تھے، بلکہ میں تو ان سے گپ شپ بھی لگاتا تھا۔ میں نے گیٹ کے پاس آ کر دیکھا تو وہاں دو پلاسٹک کے خول پڑے نظر آئے۔ لائٹ تو

آج گئی نہیں، اس لیے خول صاف نظر آئے۔ ان کو دیکھ کر مجھے حیرت سی ہوئی۔ میں نے گیٹ کو دھکیلا تو اندر دونوں پہرے دار لمبے لیٹے نظر آئے، ساتھ ہی اندر سے کچھ آوازیں کانوں میں آئیں۔ میرے کان کھڑے ہوگئے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا۔ یوں بھی آخر میں ایک فوجی ہوں۔ میں فوراً واپس پلٹا۔ میرے گھر کے گیٹ کے قریب ہی لان میں ویٹ لفٹنگ کا سامان رہتا ہے۔ بس میں نے جلدی میں یہ مگدر رکھ لیا اور اِدھر آ گیا۔ اس وقت شخص کلاشن کوف تان چکا تھا، لیکن آپ پر یہ فائر کس طرح کر سکتا تھا۔ آپ کی حفاظت تو اس کائنات کا مالک کر رہا تھا۔''

عین اسی وقت پولیس کے سائرن سنائی دینے لگے۔ جلد ہی پوری کوٹھی پولیس کے گھیرے میں نظر آئی۔ پولیس انسپکٹر اپنے چند ماتحتوں کے ساتھ اندر آ گیا۔

اسے جو حالات سنائے گئے تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ زخمی ڈاکوؤں کو دیکھ کر تو وہ زور سے اُچھلا۔

''یہ... یہ لوگ تو معاشرے میں نامی گرامی نیک لوگ ہیں۔''

''تب پھر ان کا اصل روپ یہ ہے۔'' کرنل بولے۔

ان چاروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس اپنی کارروائی مکمل کر کے چاروں ڈاکوؤں کو لے کر چلی گئی۔

''کرنل صاحب! آپ کا یہ کارنامہ ہمیں ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہم ہمیشہ آپ کے احسان مند رہیں گے۔''

''کیسی باتیں کرتے ہیں سیٹھ صاحب! میں آپ کا پڑوسی ہوں اور پڑوسی کا تو بہت زیادہ حق ہے۔ میں نے تو بس ایک مگدر ہی تو مارا ہے۔'' انھوں نے ایسے انداز میں کہا کہ سب ہنس پڑے۔

''اور غلام محمد! تم نے تو ہمیں بس خرید لیا۔ ہم تمام زندگی تمھارے احسان مند رہیں گے۔''

''ایسی بات نہ کہیں سیٹھ صاحب! یہ سب کام تو بس اللہ کے کام ہیں۔ انسان کا اس میں کیا کمال۔ وہ ذات مسبب الاسباب ہے، جسے بچانا چاہے، اسے کوئی مار نہیں سکتا اور جسے مارنا چاہے، اسے کوئی بچا نہیں سکتا۔''

ان سب کے سر ہلنے لگے۔ وہ رات انھوں نے آنکھوں میں کاٹی، ان حالات میں نیند کہاں آتی۔ دوسرے دن غلام محمد جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس وقت سیٹھ صاحب نے کہا: ''غلام محمد! ہم سب تمھیں تمھارے گھر تک چھوڑنے چل رہے ہیں۔ کرنل صاحب بھی ہمارے ساتھ چل رہے ہیں اور غلام محمد! کل جب تم نے دفتر میں بات کی تھی، اس وقت میں نے تین بہنوں کے لیے پچاس پچاس ہزار دینے کا ارادہ کر لیا تھا، لیکن اب مجھے یہ رقم اتنی چھوٹی لگ رہی ہے کہ کیا بتاؤں۔ اب میں تینوں بہنوں کے لیے دو دو لاکھ دے رہا ہوں۔''

''نہیں سیٹھ صاحب! یہ نہیں ہوگا۔'' غلام محمد نے کہا۔

''کیا مطلب، کیا نہیں ہوگا۔''

''کل جو آپ نے سوچا تھا، بس وہی مناسب ہے۔ اس سے زیادہ ہرگز نہیں لوں گا۔''

''لیکن اب...... اس واقعے کے بعد یہ رقم کم لگ رہی ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں، بس ہمارے لیے یہ بہت ہے۔''

وہ برابر اصرار کرتے رہے، لیکن غلام محمد نہ مانا۔ آخر وہ مجبور ہوگئے۔

دوپہر کے بعد وہ غلام محمد کو لے کر اس کے گاؤں کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس وقت سیٹھ صاحب نے کہا: ''غلام محمد! تم ہمارے دلوں میں ہمیشہ موجود ہوگے اور ہم تمھاری بہنوں کی شادی میں بھی شرکت کریں گے۔''

''بلکہ سیٹھ صاحب! میں بھی آپ کے ساتھ آؤں گا۔'' کرنل صاحب بول اٹھے اور ان سب کے چہروں پر مسکراہٹیں ناچنے لگیں۔

☆

وہ کون تھا؟

رانا محمد شاہد

موصل شہر میں مسلمانوں کا ایک بہادر بادشاہ رہتا تھا۔ اس کا نام عمادالدین زنگی تھا۔ ایک روز سلطان زنگی گھوڑے پر سوار جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک بوڑھا ترک اور ایک لڑکا ملا۔ دونوں چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ سلطان کو ان پر رحم آ گیا۔ گھوڑا روک کر پوچھا: ''تمھیں کیا دُکھ ہے؟''

لڑکا بہت نڈر تھا۔ آگے بڑھ کر بولا: ''ہم لٹ گئے۔ شہر ''رہا'' کی نصرانی فوج نے ہمارا گھر لوٹ لیا اور ماں، بہنوں کو پکڑ کر لے گئے۔''

سلطان زنگی بولا: ''افسوس، تم نے کچھ نہ کیا۔''

لڑکا بولا: ''ہم کیا کرتے؟ ہمارا سردار سلطان زنگی بڑا بے خبر ہے۔ وہ یہ سب ظلم دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کرتا۔ ہم اس کے پاس جا رہے ہیں۔''

سلطان زنگی گھوڑے سے اُتر گیا اور بولا: ''میں ہی وہ بدنصیب زنگی ہوں، جس کے پاس تم جا رہے ہو۔''

لڑکا یہ سن کر فوراً اس کے قدموں میں گر پڑا۔ سلطان زنگی دونوں باپ بیٹے کو قلعے میں لے گیا۔ ان کی خوب خاطر تواضع کی اور آرام سے رہنے کی جگہ دی۔ اگلے دن سب فوجی افسروں کو جمع کیا اور ان سے کہا: ''اے میرے بہادرو! تم نے بڑی بڑی لڑائیاں جیتی ہیں اور بڑے بڑے منھ زور دشمنوں کو نیچا دکھایا ہے۔ مجھے تمھاری بہادری پر پورا پورا بھروسا ہے۔ کل ''رہا'' کے قلعے پر میری تلوار چمکے گی۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کل ''رہا'' کے پھاٹک پر کون میرے ساتھ لڑے گا۔''

شہر ''رہا'' موصل سے ۹۰ میل کے فاصلے پر تھا۔ سب کو حیرت تھی کہ بادشاہ یہ کیا [illegible] رہا ہے۔ ایک رات میں فوج کا اتنی دور جانا دشوار تھا۔ کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ جواب [illegible]۔ اتنے میں ایک طرف سے ایک لڑکے کی آواز آئی: ''ہم کل بادشاہ کے ساتھ ہوں گے۔''

سب گھبرا کر لڑکے کی طرف دیکھنے لگے۔

ان میں سے ایک جھنجلا کر بولا: ''صاحب زادے! تم ابھی بچے ہو۔ یہ بچوں کا کھیل [illegible] ہے۔ تم تو اندھیرے میں گھر سے نکلتے ہوئے ڈرو گے۔ تمھیں ان باتوں سے کیا کام؟''

یہ سن کر سلطان کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ وہ بولا: ''یہ بچہ ٹھیک کہتا ہے۔ خدا کی [illegible] اس کی صورت کہہ رہی ہے کہ یہ [illegible]''

یہ لڑکا وہی تھا، جو سلطان کے ساتھ [illegible] تھا۔ اب کس میں ہمت تھی کہ کچھ کہے۔ [illegible] نے تلواریں کھینچ لیں اور لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے۔ فوجیں اسی وقت روانہ ہو گئیں۔

[illegible]لطان زنگی اور وہ بہادر لڑکا بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دیے اور اگلے دن وہ [illegible]پہر تک ''رہا'' کے پھاٹک پر کھڑے تھے۔ ''رہا'' کا فرنگی بادشاہ کچھ دن کے لیے ایک [illegible]ات میں آرام کرنے چلا گیا تھا۔ جب کچھ فوج [illegible] گئی تو سلطان نے قلعے پر دھاوا بول [illegible] اب کیا تھا، سپاہیوں کے غول کے غول قلعے سے باہر نکل آئے اور باقاعدہ جنگ شروع [illegible]ئی۔ سلطان زنگی کی بہادری دنیا جانتی تھی۔ اس کی صورت دیکھ کر بڑے بڑے جنگجو [illegible]ک رہے تھے۔ جو سامنے آتا، دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر پڑتا۔ شام تک ہزاروں آدمی [illegible]ت کے گھاٹ اُتر گئے۔ ایک جگہ سلطان زنگی نے نعرۂ تکبیر [illegible] کر ایسا حملہ کیا کہ سپاہیوں کو [illegible]ڑ کر پھاٹک تک پہنچ گیا اور اس زور سے پھاٹک پر نیزہ مارا کہ نیزہ ٹوٹ گیا۔ سلطان کو [illegible] دیکھ کر دشمن اس پر ٹوٹ پڑے۔ زنگی نے میان سے تلوار کھینچ لی۔ اتنے میں دشمن کی فوج [illegible] دیو نما افسر ایک گھوڑے پر سوار، لوہے کا لباس پہنے سامنے آیا اور اپنا بھاری گرز اس زور [illegible] مارا کہ اگر سلطان پھرتی سے نہ ہٹ گیا ہوتا تو مارا جاتا، گرز زمین پر پڑا۔ جواباً زنگی نے

اس زور سے تلوار ماری کہ اگر دشمن کے بدن پر لوہے کی چادر نہ ہوتی تو لکڑی کی طرح کٹ جاتا۔ اتنا ہوا کہ کچھ لوہا کٹ گیا۔ لیکن وہ دیو جیسا آدمی پھر بھی زخمی نہ ہوا۔ اچانک اس نے ہاتھ اُٹھا اور سلطان پر پڑا ہی چاہتا تھا کہ ایک سوار بجلی کی طرح بیچ میں آ گیا۔ جہاں سے لوہا کٹا تھا، وہاں پر تلوار کا ایسا وار کیا کہ دشمن کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ دشمن کی فوج اپنے بہادر افسر کا یہ حال دیکھ کر سخت بددل ہو گئی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔ اب ''رہا'' کا شہر مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ جیالا سوار جس نے سلطان کی جان بچائی، یہ وہی لڑکا تھا جس نے سلطان سے کہا تھا کل ہم بادشاہ کے ساتھ ہوں گے۔ یہ لڑکا تاریخ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے بیت المقدس کو فتح کیا اور فاتح بیت المقدس کہلایا۔

عظیم فلسفی سقراط

سقراط جو دنیا کا پہلا عظیم فلسفی شمار کیا جاتا ہے، اس نے کوئی کتاب نہیں لکھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لکھنا نہیں جانتا تھا۔

سقراط انتہائی بدصورت تھا، اس کے ایک شاگرد نے اس کی مثال ایک ایسے مجسمے سے دی جو اوپر سے تو نہایت بدصورت نظر آتا ہو، لیکن اس کے اندر خوب صورتی ہو۔ وہ خود پیشے کے لحاظ سے مجسمہ ساز تھا۔ سقراط کبھی پیسے کمانے کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوا، اسی لیے اس کی بیوی جو بہت چڑچڑی تھی، ہمیشہ اس سے لڑتی رہتی تھی۔

سقراط نے جوانی میں ایک مرتبہ میدان جنگ میں بہادری کا انعام حاصل کیا تھا۔

سقراط کی قوتِ برداشت کمال کی تھی۔ سارے شہر میں وہی ایک تھا جو ننگے پیر برف پر گھومتا رہتا تھا۔

مرسلہ: شائلہ خاور، دستگیر سوسائٹی، کراچی

بیت بازی

[illegible] نبیؐ کی نعت میں مصروف ہوتا ہے قلم
[illegible] کیسے خوش نما موتی پروتا ہے قلم

شاعر: مولانا ظفر علی خاں — پسند: حیدر کمال علی، میرپور خاص

[illegible] کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے
[illegible] جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

شاعر: حفیظ جون پوری — پسند: ام ہدیٰ، میرپور خاص

[illegible] مجھ کر ہی ہوا ہوں موج دریا کا حریف
[illegible] میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

شاعر: وحشت کلکتوی — پسند: آمنہ حیدر [illegible]

[illegible]رف اک قدم اُٹھا تھا غلط راہِ شوق میں
[illegible] تمام عمر ہمیں ڈھونڈتی رہی

شاعر: عبدالحمید عدم — پسند: ثوبان منظور، ڈھڈیال

[illegible] شہرِ خفتگاں میں کوئی تو اذان دے
[illegible] ایسا نہ ہو زمین کا جواب آسمان دے

شاعر: حمایت علی شاعر — پسند: عائشہ خالد قریشی،

[illegible] و آہن کے بھی سینوں میں شرر جاگ اُٹھے
[illegible] انساں ہے کہ محرومِ بصیرت ہے ابھی

شاعر: ماہر القادری — پسند: محمد فہد خان چغتائی، ڈیرہ غازی خان

[illegible] میں آ کر پڑھنے والے بھول گئے
[illegible] کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

شاعر: اسلم کولسری — پسند: محمد [illegible]، ساہن پال شریف

جس طرح ممکن ہو تعمیرِ چمن کرتے رہو
کام اپنا اے محبانِ وطن کرتے رہو

شاعر: احسان دانش — پسند: [illegible]، اوکاڑہ

راہبر میرا بنا گم راہ [illegible] کے لیے
مجھ کو سیدھے راستے [illegible] اس نے کیا

شاعر: [illegible] — پسند: [illegible]، اورنگی ٹاؤن

[illegible] پھری ہوا سے کہو
[illegible] ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

شاعر: [illegible] — پسند: بازل نظامی، کراچی

آج [illegible] نہیں ہیں جو یہاں آپس میں
ایک ہی گھر میں کبھی مل کے رہا کرتے تھے

شاعر: [illegible] — پسند: کاوش نظامی، کراچی

جن لوگوں کو خواب سہانے لگتے ہیں
ان کی بیداری میں زمانے لگتے ہیں

شاعر: [illegible] احمد ضیا — پسند: سامعہ ثناء اللہ، کراچی

ہم [illegible] رہے تھے کہ گلستان میں آ گئے
آنکھیں کھلیں تو دیکھا، بیاباں میں آ گئے

شاعر: سید سخاوت علی جوہر — پسند: سید شباہت علی ہاشمی، کراچی

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا

شاعرہ: پروین شاکر — پسند: محمد ابوبکر وقاص

پھاٹک نواب دولھا

وقار محسن

کل رات کچھ ضروری کاغذات تلاش کر رہا تھا کہ اپنی میٹرک کی سند نظر آ گئی۔ بیش تر کاغذات پچاس سال کی گرد میں بہت پھیکے پڑ گئے تھے، البتہ پتا بالکل صاف تھا، گلی نمبر ۷، پھاٹک نواب دولھا۔ بہاری پور...... پھاٹک نواب دولھا کے نام سے اچانک یادوں کی ایک کہکشاں سی روشن ہو گئی اور پھاٹک کی چند بھولی بسری شخصیات یوں سامنے آ گئیں جیسے کل کی بات ہو۔

پھاٹک نواب دولھا کبھی پھاٹک رہا ہوگا، اب تو صرف چھوٹی سرخ اینٹوں کے دو ستون تھے، جن پر بے شمار پرندوں کے گھونسلے تھے۔ شام کے جھٹپٹے اور صبح سویرے پرندوں کی چہچہاہٹ سے پورا محلہ گونج اٹھتا۔ پھاٹک میں ہمارے گھر کے علاوہ چار گھر تھے۔ سامنے تین کے دروازے والا مکان ''چچا ڈاک گاڑی'' کا تھا۔ چچا کا نام تو چودھری کرم دین تھا اور کئی سال پیش تر مویشی خانہ کی نوکری سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ بوٹا سا قد نکھرتا ہوا رنگ، پتلا چہرہ، ٹھوڑی پر ننھی سی داڑھی، جسم پر سرمئی رنگ کی شیروانی اور اسی رنگ کی ٹوپی جس کے چاروں طرف پسینے اور میل کی بیل سی بنی رہتی۔ چہرے پر ایک لازوال مسکراہٹ جو بچوں کی صحبت میں اور گہری ہو جاتی۔ ہم اپنے گھر میں کھیل کود میں مشغول ہوتے کہ اچانک گلی میں ''ڈاک گاڑی...... ڈاک گاڑی'' کا شور سنائی دیتا اور ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ چھلانگیں لگاتے باہر آ جاتے۔ سامنے ڈاک گاڑی سڑک پر رواں دواں ہوتی۔ دائیں ہاتھ میں چھڑی جسے وہ درمیان سے پکڑتے اور لپکتے جھپکتے اس کو انجن کے پسٹن کی طرح ہلاتے نظر آتے۔ گھر کی بالکونیوں، گلی نکڑوں سے لڑکے دونوں ہاتھ، منہ پر رکھ کر بھونپو سا بناتے اور ہر طرف سے ڈاک گاڑی...... ڈاک گاڑی کی آوازیں گونجتیں۔ چچا کے لیے ایکسیلیٹر کا کام کرتیں اور وہ تقریباً بھاگنے لگتے۔ شام کو جب واپس ہوتے تو گلی کے بچے ان کے گرد جمع ہو جاتے اور وہ اپنی شیروانی کی جیبوں سے مٹھائی کی گولیاں، مونگ پھلی، میٹھے الائچی دانے، سیو، اور جھڑ بیری کے بیر نکال کر بچوں کو بانٹ دیتے۔

جنوبی سمت والا مکان بیری والی اماں کا تھا، جس کے دروازہ کی چوکھٹ میں دروازوں کی جگہ ایک پرانا ٹاٹ کا پردہ جھولتا رہتا تھا۔ اماں بیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھیں اور کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کمی کو انھوں نے محلے کے بچوں اور بیری پر بسیرا کرنے والے پرندوں سے پورا کر لیا تھا۔ چار فیٹ اونچی شکستہ دیوار پر دو کنڈلیوں میں باجرا اور دو میں پانی وہ فجر کے وقت ہی بھر دیتیں اور سورج نکلنے سے پہلے بیری کے پرندے دیوار پر دھاوا بول دیتے۔ صبح ہوتے ہی محلے کے بچے سپارے اور قاعدے لیے آنا شروع ہو جاتے اور کھپریل کے نیچے بچھی نیلی دری پر بیٹھ کر ہل ہل کر سبق یاد کرنا شروع کر دیتے۔ محلے میں کوئی خوشی، غمی ہوتی، اماں ہمیشہ پیش پیش ہوتیں۔ ان کے گھر کے کچے آنگن میں [illegible]

درخت شامیانے کی طرح سایہ کیے رہتا۔ جب ہم بیروں کے لیے ضد کرتے تو وہ کہتیں: ''ارے شریرو! مان جاؤ۔ ابھی کچے ہیں۔ گلے آجائیں گے تو اما، باوا ڈاکٹروں، حکیموں کے پاس خوار پھریں گے۔'' ہمارے اصرار پر کوٹھری میں سے بانس نکال کر لاتیں اور سنہرے سنہرے بیر گراتیں اور ہم ٹپ ٹپ گرتے بیروں پر ٹوٹ پڑتے۔ ایک بار محلے کی خاتون نے بچے کی فیس کے طور پر کچھ رقم بھجوائی تو وہ فوراً اپنا شٹل کاک والا برقع ڈال کر اس گھر میں پہنچ گئیں اور دوپٹے کے پلّو سے وہ رقم کھول کر ان خاتون کے حوالے کرتے ہوئے غصے سے کہنے لگیں: ''بہن! لو، رکھو اپنی دولت۔ تم ہو گی رانی اپنے گھر کی۔ یہ بچے تو اللہ تعالیٰ کے باغ کے پھول ہیں۔ ان سے میری جھونپڑی میں روشنی رہتی ہے۔ ان کو پڑھانا تو میری عبادت کا حصہ ہے۔''

پھاٹک کی تیسری باغ و بہار شخصیت، بھاری پور، محلے کی شان جناب امجد خان المعروف ''چچا پولیس'' تھے۔ ہم نے جب ہوش سنبھالا تو چچا کو پولیس کی نوکری سے ریٹائر ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ وہ ہمیشہ چوڑے پائنچوں کا پائجامہ اور خاکی رنگ کی پولیس یونیفارم کی قمیص پہنے رہتے۔ قمیص کے دونوں کاندھوں پر دو ہک تھے، جن میں کبھی پیتل کے پولیس کے بیج چمکتے ہوں گے۔ اب ان میں پاکستان کے جھنڈے کے دو ننھے ننھے بیج نظر آتے تھے۔ جب بھی ان کو کسی بات کا یقین دلانا ہوتا تو وہ قسم کھانے کے انداز میں بائیں کاندھے کے جھنڈے کو چھو کر اپنا مدعا بیان کرتے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کے معمول میں فرق نہیں آیا تھا اور ان کا محلے میں رات کا گشت جاری رہتا تھا۔ جب جاڑوں کی راتوں میں ہم لحافوں میں لپٹے مونگ پھلیاں کھا رہے ہوتے تو رات کے سناٹے میں چچا کے مخصوص ڈنڈے کی آواز کسی دکان کے تختے یا دروازے سے ٹکراتی اور ان کی گنگناہٹ گونجتی: ''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارہ''

ایک بار کچھ لوگوں نے، بے ربط الفاظ میں کہا کہ اب وہ ریٹائر ہو گئے ہیں اور اب اس قسم کے گشت ان کے فرائض میں شامل نہیں، تو انھوں نے مسکرا کر جواب دیا: ''میاں! ڈاکٹر، ٹیچر اور پولیس مین کبھی ریٹائر نہیں ہوتے۔''

صبح کو جب چچا کاندھے پر اپنا نیلے رنگ کا انگوچھا ڈال کر نکلتے تو چاروں طرف سے فرمائشوں کی بارش ہوتی۔

''چچا! لینا، ہمارا بجلی کا بل جمع کرا دینا۔''

''چچا! ذرا، بشیر بیٹا کی فیس جمع کرا دینا۔''

''چچا! لینا ذرا آٹا چکی پے ڈال آنا۔''

''چچا! ٹلو مستری کے لڑکے کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے ذرا چوکی تک ہو آنا۔''

چچا سارے کام اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں ریکارڈ کرتے جاتے اور شام کو واپسی پر ہر متعلقہ گھر کے دروازہ کی کنڈی کھٹ کھٹا کر کام کی تکمیل کی اطلاع دیتے۔

پھاٹک کی چوتھی ناقابل فراموش شخصیت جناب ہدیٰ خاں ہیکڑ کی تھی۔ وہ کس طرح ہدایت خاں سے ہدیٰ خاں کے مقام تک آئے اس کی لمبی داستان ہے۔ وہ ہیکڑی کا بلا اور افواہوں کی تخلیق اور تشہیر کے بادشاہ تھے۔ ہدیٰ خاں چھوٹے قد کے دبلے پتلے سے آدمی تھے، لیکن ہیکڑ بلا کے تھے۔ گہرے نیلے رنگ کا کرتا ان کے گھٹنوں کے نیچے تک لٹکتا رہتا۔ مٹیالے رنگ کا علی گڑھ کٹ پائجامہ جو اچھے وقتوں سفید رنگ کا رہا ہوگا، زیب تن کرتے۔ سر کے عقبی حصے پر نیلے ہی رنگ کی جالی دار ٹوپی پیالے کی مانند اٹکی ہوتی۔ کمر بند کے سرے سے چھالیا اور تمباکو کا بٹوا جھولتا رہتا۔ بات کرتے تو آواز کا آدھا اخراج ناک سے ہوتا۔ چہرے کا رنگ سیاہی مائل تھا جیسے چوسا ہوا دیسی آم ہو۔

جب وہ اپنے فرضی معرکوں کی داستانیں سناتے تو کرتے کا گریبان مزید اوپر کر کے اپنے طرف کے گنجان جنگلات کا ذکر کرتے، جہاں انھوں نے صرف ایک لاٹھی سے خوں خوار شیر کو ڈھیر کیا تھا۔ اپنی طرف کے جنگلات سے ان کی مراد ان کے آبائی وطن بداؤں (بدایوں) کے امرود کا وہ باغیچہ تھا جہاں امرود کے تین چار سوکھے درخت اور کچھ خودرو جھاڑیاں تھیں۔ یوں تو ہدیٰ خان کی مہمات کی بے شمار داستانیں ہیں لیکن یہاں صرف ایک واقعہ سن لیں۔

ایک دن ہدیٰ خان انگلیاں چاٹتے ہوئے طفیل کبابیے کی دکان سے نکل رہے تھے کہ اوپر سے کسی نے دال پھینکی جو ان کی جالی دار ٹوپی سے بہتی ہوئی ان کے چہرے پر پھیل گئی۔ ہدیٰ خاں دہاڑے: ''یہ کون نالائق ہے؟ نیچے آ بدتمیز۔ ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔''

''کیا ہے؟ کون شور مچا رہا ہے؟'' اوپر سے ایک کرخت آواز آئی۔ ہدیٰ خاں نے دیکھا کہ اوپر کے مکان کی بالکنی میں ایک کالا بھجنگ پہلوان ان کو خوں خوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پہلوان کو دیکھتے ہی ہدیٰ خاں بتاشے کی طرح بیٹھ گئے اور چہرے پر بکھری دال کو انگلی سے

چکھنے کے بعد گھگھیا کر بولے: ''اوہو...... مونگ کی دال ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میں
ماش کی دال ہے جو مجھے بہت ناپسند ہے۔''

اچانک ہوا کے تیز جھونکے سے کھڑکی کا پلڑا دیوار سے ٹکرایا اور میں چونک پڑا
میرے ہاتھ سے میٹرک کی ڈگری گر گئی اور یادوں کی روپہلی کہکشاں بکھر گئی۔

☆☆☆

چمچہ چونچ پرندہ

اپنی چمچے جیسی چونچ کی وجہ سے یہ پرندہ روسیٹ اسپون بل (ROSEATE SPOON BILL) کہلاتا ہے۔ جہاں یہ ڈھیر ساری مچھلیاں ایک ساتھ دیکھتا ہے، فوراً اپنی چونچ ڈال کر جھٹکے سے بند کر لیتا ہے۔ چمچے کے بیچ کی قدرتی چھلنی سے مٹی اور کیچڑ تو باہر نکل جاتا ہے، مگر مچھلیاں منھ میں ہی رہ جاتی ہیں۔ اس طرح اس چمچے نما چونچ سے یہ نرالا پرندہ ایک وقت میں ڈھیر ساری مچھلیاں پکڑ لیتا ہے۔ ☆

مرسلہ: ظفر شمیم، ہرنائی، بلوچستان

آیئے مصوری سیکھیں

غزالہ امام

کسی چیز کی تصویر میں حقیقت کا رنگ پیدا کرنے کے لیے اس پر روشنی کا شیڈ نمایاں کیا جاتا ہے۔

تصویر نمبر ایک میں درخت پر سورج کی روشنی کا شیڈ واضح کیا گیا ہے۔

تصویر نمبر ۲ میں روشنی کا شیڈ زمین پر بھی پڑ رہا ہے۔

تصویر نمبر ۳ کے پس منظر میں آسمان دکھا کر ڈرائنگ مکمل کی گئی ہے۔ اسی طرح مختلف مناظر کے خاکے بنا کر مشق کرتے رہنے سے مہارت ہو جائے گی۔ ☆

ایک قدیم کلاسیکی داستان آرائش محفل یا قصہ حاتم طائی (آخری ٹکڑا)

حمام بادگرد کی خبر لاؤ

داستان: حیدر بخش حیدری - خلاصہ: سید علی اسد

چند روز کے بعد حاتم ایک شہر کے قریب پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک کنویں کے گرد بہت سے لوگ جمع ہیں۔ حاتم نے پوچھا تو کسی نے کہا: ''اے عزیز! یہاں کے حاکم کا بیٹا دیوانہ ہو کر اس کنویں پر بیٹھ رہا تھا۔ آج تیسرا دن ہے، اس نے اپنے آپ کو اس میں گرا دیا۔ ہر چند ہم اس میں کانٹے اور رسیاں ڈال ڈال کر ڈھونڈتے ہیں، مگر اس کی لاش نہیں ملتی۔ جان کے خطرے سے کوئی اُترتا بھی نہیں۔''

اتنے میں اس کے ماں باپ گریبان پھاڑے وہاں آ پہنچے اور کنویں پر بیٹھ کر اس طرح رونے لگے کہ پرندے بھی فریاد کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر حاتم کا دل بھر آیا۔ اس نے کہا: ''خاطر جمع رکھو۔ میں اپنے سر کو خدا کی راہ میں ہتھیلی پر دھرے پھرتا ہوں۔ میں کنویں میں جا کر تمھارے بیٹے کی لاش ڈھونڈتا ہوں۔ تم ایک مہینے تک میری راہ دیکھنا۔ اگر آیا تو بہتر، ورنہ اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہو جانا۔''

یہ کہہ کر حاتم کنویں میں کود پڑا، کئی غوطے کھائے، آخر پاؤں تہ کو جا لگے، آنکھیں کھول دیں، اب نہ کنواں نظر آیا نہ پانی، ایک وسیع میدان دکھائی دیا۔ آگے چلا، پھر ایک باغ نظر آیا۔ طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے اور درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ اتنے میں ایک جماعت پری زادوں کی ایک جگہ بیٹھی دکھائی دی اور ایک تخت پر ایک خوش رو جوان بھی نظر آیا۔ حاتم گنجان درختوں میں چھپ کر دیکھنے لگا۔ اتنے میں پریوں کی نظر اس پر جا پڑی۔ انھوں نے اپنے سردار کو بتایا۔ اس نے اس جوان سے کہا: ''تمھارا

بھائی بند ایک اور بھی آ پہنچا ہے، کہو تو بلائیں؟''

اس نے کہا: ''بہت بہتر۔''

چناں چہ وہ حاتم کو لے آئے۔ پری زاد اور جوان اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ا
پاس بٹھلایا۔ احوال پوچھنے لگے۔ حاتم نے اپنا نام بتایا اور یہاں تک آنے کا قصہ بیان
یہ سن کر اس جوان نے کہا: ''اے بھائی! ایک دن میں اس کنویں پر آ نکلا اور اس رشک
پر میری نظر پڑی۔ بس اس کی محبت میں دیوانہ ہو گیا۔ یہ روز اپنی جھلک دکھا کر چلی جاتی
آخر اس کی محبت نے مجھے اس کنویں میں گرا دیا۔''

حاتم نے کہا: ''افسوس ہے۔ تُو یہاں رنگ رلیاں منا رہا ہے، وہاں تیرے
باپ کا حال تباہ ہو رہا ہے۔''

وہ بولا: ''میں مجبور ہوں۔ اگر یہ رخصت دے تو میں جاؤں۔''

یہ سن کر حاتم، پری سے کہنے لگا: ''بہتر یہی ہے کہ اس جوان کو چند روز کی رخصت
دے، تاکہ یہ اپنے والدین سے ملے۔''

پری نے کہا: ''یہاں کس نے منع کیا ہے، ابھی چلا جائے۔''

یہ سن کر حاتم نے کہا: ''اُٹھ کھڑا ہو۔ پری نے اجازت دے دی۔''

وہ بولا: ''یہ اجازت نہیں بلکہ اشارہ ہے۔ مجھ سے یہ وعدہ کرے کہ ہفتے میں
تین بار مجھ سے ملاقات کرتی رہے گی۔''

غرض پری راضی ہو گئی، مگر اس مہمان داری میں ایک مہینا گزر گیا اور وہاں کنویں پر
لوگ انتظار کر رہے تھے، کہنے لگے: ''اگر آج وہ جوان نہ نکلا تو اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے۔''

اکتیسویں دن حاتم نے اس جوان سے کہا: ''اب میں نہیں رہ سکتا۔ چناں چہ
نے اپنی سہیلیوں سے کہا کہ ان دونوں کو کنویں پر پہنچا آؤ۔ انھوں نے ایک جست

...وں کو کنویں پر بٹھلا دیا۔ سب لوگ دیکھ کر حیران رہ گئے۔

اس کے ماں باپ حاتم کے قدموں پر گر پڑے، پھر خوشی خوشی شہر میں داخل
ہوئے۔ حاتم کی دعوت کی۔ پندرھویں دن حاتم وہاں سے رخصت ہوا اور جنگل کا راستہ لیا۔

ایک مدت کے بعد ایک بستی نظر آئی۔ شہر پناہ کے باہر ایک بوڑھا کھڑا تھا۔ حاتم
نے اسے سلام کیا۔ اس نے حاتم کو اپنا مہمان بنا لیا۔ کھانے کے بعد بوڑھے نے کہا: ''اے
جوان! تیرا نام کیا ہے اور کہاں جائے گا؟''

اس نے کہا: ''حاتم نام ہے۔ یمن کا رہنے والا ہوں۔ حمام بادگرد کی خبر کو جاتا ہوں۔''

یہ سنتے ہی اس نے سر نیچا کر لیا، پھر کہا: ''وہ کون تیرا دشمن تھا، جس نے تجھے ایسی
جگہ بھیجا۔ اول تو یہ کہ اس کا نشان معلوم نہیں، دوسرے جو کوئی وہاں گیا سو گیا، پھر نہ واپس
آیا اور سنتے ہیں کہ شہر قطان کے بادشاہ حارث قطان نے اس کی سرحد پر چوکی بٹھائی ہے کہ
جو کوئی اس حمام کی خواہش کر کے آئے، اسے پہلے میرے پاس لے آؤ۔ معلوم نہیں کیوں
بلواتا ہے، مار ڈالتا ہے یا چھوڑ دیتا ہے۔''

یہ سن کر حاتم نے حسن بانو کا قصہ سنایا اور کہا کہ خدا کے فضل سے چھے سوال پورے کر چکا
ہوں اور اب ساتواں سوال حمام بادگرد کی خبر ہے، اگر تُو جانتا ہے تو شہر قطان کی راہ مجھے دکھا دے۔

اس بوڑھے نے جو دیکھا کہ اس کا ارادہ کامل ہے، ساتھ ہو لیا اور شہر کے باہر
جا کر کہا: ''اے مسافر! یہاں سے داہنی طرف کا راستہ اختیار کر۔ آگے بہت سے شہر ملیں
گے، پھر ایک پہاڑ نظر آئے گا اُس کے نیچے ہزاروں آفتیں ہیں۔ اگر ان سے بچ نکلے گا تو
ایک جنگل ملے گا۔ تھوڑی دور جا کر دوراہا آئے گا۔ بائیں طرف کو جانا، شہر قطان پہنچ جائے
گا۔ اگرچہ داہنی طرف کی راہ نزدیک ہے، مگر اس میں بہت سی آفتیں ہیں۔''

حاتم اس کو رخصت کر کے روانہ ہوا۔ چند روز کے بعد ایک شہر نظر آیا اور نقاروں

کی آواز سنائی دی۔ حاتم جی میں کہنے لگا کہ آج شاید کسی کے ہاں شادی ہے۔ لوگ ... ہیں، راگ رنگ ہو رہا ہے۔ چولھوں پر دیگیں کھڑک رہی ہیں۔ دیکھ کر پوچھنے لگا: "اس ... میں کیا شادی ہے؟"

وہ بولے: "اس ملک کی رسم ہے کہ سال میں ایک دن امیر غریب بلکہ بادشاہ وزیر بھی اپنی اپنی لڑکیوں کو دلہن بنا کر خیموں میں بٹھلا دیتے ہیں۔ پھر ایک بڑا سا سانپ جنگل سے آتا ہے اور ایک جوان کی شکل بن کر ہر ایک کے خیمے میں جا کر ان سب کو دیکھتا ہے۔ جو پسند آتی ہے، اس کو لے جاتا ہے۔ ہم نے اس کی دہشت سے منھ پر بے حیائی کا نقاب ڈال کر مجبوراً یہ شادی رچائی ہے۔ بے بس ہیں، کیا کریں۔ شام کے وقت وہ آئے گا۔"

یہ سن کر حاتم اپنے جی میں کہنے لگا کہ یہ کام جن کا ہے۔ حقیقت میں وہ سانپ نہیں ہے۔ پھر ان سے مخاطب ہوا: "ان شاء اللہ آج کی رات میں اس آفت کو تمھارے سر سے دور کر دوں گا۔"

انھوں نے جا کر اپنے سردار کو یہ بتایا۔ وہ سنتے ہی اس کو بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے کہا: "اے جوان! یہ کیا راز ہے؟"

حاتم نے کہا: "میں خوب جانتا ہوں کہ وہ جن ہے۔ اب جو کچھ میں کہوں، اسے قبول کرو۔"

شاہ نے کہا: "بسر و چشم!"

پھر حاتم نے کہا: "جس وقت وہ آئے اور جس کی لڑکی پسند کر کے لے چلے، اس وقت تُو اس سے کہہ کہ تم لے جانے میں مختار ہو، مگر اتنی بات ہماری بھی سنو کہ ہمارا ایک سردار مدت کے بعد آج آیا ہے۔ اب ہم اس کے تابع دار ہیں۔ اس کی اجازت کے بغیر اس لڑکی کو تمھارے ساتھ نہیں کر سکتے۔ تم غصے ہو تو ایک برس میں ہمارے ملک کو خراب کر دو گے، مگر وہ خفا ہو گا تو ایک پل میں خاک سیاہ کر دے گا۔"

بادشاہ نے تمام دن حاتم کو اپنے ساتھ رکھا۔ جب شام ہوئی، سانپ کی آمد آمد کا غل ہوا۔ لوگوں نے کہا: "اے جوان! وہ موذی آ پہنچا ہے۔"

حاتم اُٹھ کھڑا ہوا اور خیمے کے باہر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک اژدہا آسمان سے سر لگائے ہوئے چلا آتا ہے۔ درازی کا اس کا ٹھکانا ہی نہیں۔ دیو بھی اس کا سامنا نہیں کر سکتا۔ جو پتھر اور درخت اس کی چھاتی کے تلے آتا ہے، سو پس کر سرمہ ہو جاتا ہے۔ اتنے میں وہ سانپ نزدیک آیا اور اپنی دُم ایسی سخت کر کے ہلائی کہ سب آدمی سر جھکائے زمین پر گر پڑے۔ پھر وہ زمین پر لوٹ کر ایک خوب صورت آدمی بن گیا۔ جب انھوں نے اُٹھ کر اس کو سلام کیا اور بادشاہ اس کو اپنے خیمے میں لے گیا اور ایک تخت پر بٹھایا۔

وہ اُٹھا اور کہنے لگا: "اپنی اپنی لڑکیاں دکھلاؤ۔"

چناں چہ اس نے باہر نکل کر سب سرداروں، امیروں اور غریبوں کی لڑکیاں دیکھیں، مگر کسی کو پسند نہ کیا، اُلٹا پھرا۔ بادشاہ کے خیمے میں آیا۔ جہاں شاہ زادی بیٹھی تھی، وہاں گیا اور اسی کو منظورِ نظر کر کے بادشاہ سے کہا: "اسے میرے حوالے کرو۔"

یہ سن کر بادشاہ نے کہا: "ایک بزرگ زادہ بہت دنوں کے بعد واپس آیا ہے۔ اب ہم اس کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ آپ اس کو بلوالیں۔ وہ جو کہے گا، سو ہم کریں گے۔"

اس نے کہا: "اچھا بلوالو۔"

حاتم تو قنات کے قریب کھڑا تھا، فوراً ہی آ گیا۔ دیو نے پوچھا: "تُو کون ہے؟ اور کیوں ہمارے تابع داروں کو گمراہ کر کے اس ملک کو تباہ کروانا چاہتا ہے؟"

حاتم نے کہا: "جب تک میں یہاں نہ تھا، تب تک انھوں نے تیرا کہا کیا۔ اب اس ملک کا مالک میں آ گیا ہوں۔ جو کوئی ہمارے باپ دادا کی رسمیں بجالاتا ہے، بیٹی اسی کو دیتے ہیں۔"

جن نے پوچھا: ''وہ کیا ہیں؟''

حاتم نے کہا: ''میرے پاس ایک مہرہ ہے، پہلے اسے گھس کر پلاتا ہوں۔''

وہ بولا: ''لے آ، میں پیوں گا۔''

حاتم نے وہ مہرہ جو خرس کی بیٹی نے دیا تھا، اپنی جیب سے نکال کر تھوڑے سے پانی میں رگڑ کر اس کے حوالے کیا۔ جن نہ جانتا تھا کہ اس کا پینا اس کے حق میں زہر ثابت ہوگا، مارے غرور کے پی گیا اور پھر یک لخت اپنا علم بھول گیا، مگر بولا: ''اب اور کوئی رسم باقی ہو تو اس کو بھی پورا کر دوں؟''

حاتم بولا: ''دوسری رسم یہ ہے کہ ایک لکڑی کے بکس کے اندر اُترو۔ ہم اس کا ڈھکنا بند کر دیں گے۔ اگر اس کے باہر نکل آؤ تو ہم بخوشی اس لڑکی کو تمھارے حوالے کر دیں گے۔''

وہ بولا: ''جلد لاؤ۔''

حاتم نے ایک بڑا سا بکس منگوا کر رکھ دیا اور اس سے کہا: ''بسم اللہ۔'' وہ اس میں اُتر پڑا۔ حاتم نے اس کے منھ پر ڈھکنا لگا کر مضبوطی سے بند کر دیا اور اسم اعظم پڑھنے لگا۔ اس کی برکت سے ڈھکنا پہاڑ سا بھاری ہوگیا۔ اس نے بڑا زور لگایا، مگر نکل نہ سکا۔ حاتم نے لوگوں سے کہا کہ اس کے پاس اور اوپر لکڑیاں رکھ کر آگ بھڑکا دو۔ انھوں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ جن چلانے لگا: ''میں جلا میں جلا۔'' کسی نے پروانہ کی۔ آخر جل کر بھسم ہوگیا۔ پھر حاتم نے ان لوگوں سے کہا: ''اب ایک گڑھا کھود کر اس کو دفن کر دو اور اپنے گھر جا کر آرام کرو۔ اللہ نے یہ بلا دور کی۔''

بادشاہ نے حاتم کی بڑی تعریف کی۔ پھر بادشاہ نے بہت سی اشرفیاں حاتم کو پیش کیں۔ حاتم نے کہا: ''مجھے یہ درکار نہیں۔ انھیں فقیروں میں بانٹ دو۔''

چناں چہ اسی وقت مال فقیروں میں تقسیم کر دیا گیا۔

حاتم تین روز ان کا مہمان رہا۔ چوتھے دن رخصت ہو کر آگے بڑھا۔ کئی روز بعد اس پہاڑ کے نیچے جا پہنچا، جس کا ذکر اس پیر مرد نے کیا تھا۔ ذرا سستا کر اس پر چڑھا۔ آگے جا کر ایک جنگل ملا۔ جب اس سے نکلا تو ایک دوراہا ملا۔ سوچنے لگا کہ پیر مرد نے کہا تھا کہ بائیں جانا، چناں چہ بائیں طرف چلا۔ پھر چھے کوس دور جا کر سوچنے لگا کہ داہنی طرف چلنا چاہیے، اگر اللہ مدد کرے گا تو کوئی بلا میرے سامنے نہ آسکے گی۔ یہ سوچ کر اس راستے سے لوٹا اور داہنی طرف چلا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک جنگل ببول کا کانٹوں سے بھرا دکھائی دیا۔ توکل بخدا قدم اُٹھائے، تھوڑی راہ طے کی۔ آخر کانٹوں سے کپڑے پرزے پرزے ہوگئے، بدن لہولہان ہوگیا، کانٹوں سے تلوے چھد گئے، پاؤں سوج گئے۔ غرض بہ ہزار خرابی کتنے ہی دنوں میں اس جنگل سے نکلا۔ آگے بڑھا، چھپکلیوں کے جنگل میں پہنچا۔ وہ آدمی کی بو پاتے ہی اس کو کھانے کے لیے دوڑیں۔

حاتم نے دیکھا کہ ہزاروں چھپکلیاں دوڑی آتی ہیں۔ ان میں بہت سی چیتے اور کتے کے برابر ہیں اور بہت سی لومڑی اور گیدڑ کے برابر، ڈرا اور کانپنے لگا۔ اتنے میں وہ قریب آپہنچیں۔ ایک بوڑھا نورانی صورت داہنے ہاتھ کو نمودار ہوا اور کہنے لگا: ''اے جوان! تُو نے بزرگوں کا کہنا نہ مانا، آخر پشیمان ہوا۔''

حاتم نے کہا: ''بُرا کیا، نادم ہوں۔'' تب اس بزرگ نے فرمایا کہ خرس کی بیٹی کا مہرہ نکال کر زمین پر ڈال دے، وہ غائب ہو جائیں گی۔ اس نے فوراً مہرہ خرس کی بیٹی کا نکال کر زمین پر پھینک دیا۔ پہلے تو زمین پیلی ہوگئی، پھر سیاہ، آخر سبز ہو کر سرخ ہوگئی۔ چھپکلیاں دیوانی ہو کر آپس میں لڑیں اور تھوڑی دیر میں تمام ہوگئیں۔

حاتم نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اپنا مہرہ اُٹھا کر آگے چلا۔ کچھ دنوں کے بعد اژدھوں کا ایک جنگل ملا۔ وہاں کا ہر ایک ذرہ اس کے جوتوں کو چھید کر گزر جاتا۔ یہ اپنے

کپڑوں سے چیتھڑے پھاڑ پھاڑ کر جوتوں کے اندر رکھ لیتا تھا۔ اس کے پاؤں چھلنی ہو گئے۔ آخر ہزار محنت و مشقت سے اس جنگل کو طے کیا اور الحمد للہ کہہ کر ایک جگہ بیٹھ گیا اور پاؤں پر کپڑا لپیٹ کر جوتے پہن کر لنگڑاتا ہوا چل نکلا۔ چند قدم اس جنگل میں چلا تھا کہ وہاں کے بچھو آدمی کی بو پا کر دوڑے۔ بہت سے ان میں بلی کے برابر اور بہت سے لومڑی کے برابر تھے۔ ان کی دُمیں گیدڑ کی سی، پاؤں مرغ کے سے، گردنیں تختے کے مانند تھیں۔ حاتم سہم کر کانپنے لگا۔ اِدھر اُدھر تاکنے لگا کہ وہی بوڑھا پھر آ پہنچا اور بولا: ''وہی مہرہ زمین پر ان کے سامنے ڈال دے اور قدرت کا تماشا دیکھ۔'' حاتم نے جو اس مہرے کو پھینکا، وہیں زمین رنگ بدلنے لگی۔ بچھو بھی آپس میں لڑنے لگے۔ ایک ڈنک سے دوسرے کا بدن پھٹ گیا۔ حاتم دیکھتا رہا۔ تین روز میں وہ بھی تمام ہو گئے۔ چوتھے روز مہرے کو اُٹھا کر روانہ ہوا۔ چند روز بعد ایک شہر دکھائی دیا۔ اس میں داخل ہوا تو لوگوں نے پوچھا: ''اے جوان! تُو کس راہ سے آیا ہے؟''

حاتم نے کہا: ''داہنی طرف سے۔''

وہ حیران ہو کر کہنے لگے: ''تُو جیتا کیوں کر بچا، کیا چھپکلیوں اور ببول کے کانٹوں کی مصیبت، اژدہوں کے جنگل اور بچھوؤں کی آفت تجھ پر نہ پڑی؟''

حاتم بولا: ''ان بلاؤں میں مبتلا ہوا تھا، مگر مددِ الٰہی سے چھپکلیوں اور بچھوؤں کو ٹھکانے لگایا۔ اب اس راہ میں سوائے اژدہوں کے ٹکڑوں اور ببول کے کانٹوں کے کوئی چیز نہیں۔''

یہ سن کر جو سوداگر رکے ہوئے تھے، وہ اسی راہ پر چل پڑے۔ یہ خبر بادشاہ کو بھی پہنچی کہ کاروانوں نے ایک مسافر کے کہنے پر وہ راہ اختیار کی، جس میں اژدہوں اور ببول کے کانٹوں کا جنگل ملتا ہے۔ حکم کیا کہ ہرکارے ان کے پیچھے جائیں۔ راستے کے بارے میں تحقیق کر کے پھر آئیں۔ اِدھر حاتم کو بلا کر اپنے پاس رکھا اور کہا کہ چند روز یہاں آرام

کر، مگر مطلب یہ تھا کہ سچا ہوا تو خیر، ورنہ سولی دوں گا۔

چند روز بعد ہرکارے واپس آ گئے اور بادشاہ سے عرض کی کہ جو کچھ اس مسافر نے کہا تھا، سچ ہے۔ تب بادشاہ نے ہر طرف اطلاع بھجوائی کہ اب وہ راہ آفتوں سے پاک ہو چکی ہے اور حاتم سے معذرت کی اور کہا کہ مجھ سے خطا ہوئی، معاف کر، پھر بہت سا زر و جواہر اس کے آگے رکھا۔ حاتم نے کہا کہ جو کچھ عنایت ہوا ہے، میرے کس کام ہے۔ مجھے ایک ضروری کام درپیش ہے۔ بس ایک رہبر میرے ساتھ کر دیجیے، جو شہر قرطان کا راستہ بتا دے۔

بادشاہ نے کہا: ''اس شہر میں کیا کام ہے؟''

اس نے کہا: ''سنا ہے کہ حمام بادگرد اسی شہر میں ہے۔ میں اس کو دیکھنے کا مشتاق ہوں۔''

بادشاہ نے کہا: ''یہ خیال دل سے نکال دے، کیوں کہ جو کوئی اس طرف گیا، جیتا نہیں بچا۔''

غرض ہر چند بادشاہ نے منع کیا، مگر حاتم نہ مانا۔ آخر کار دو آدمی ساتھ کر دیے کہ شہر قرطان کی راہ پر اس کو پہنچا دیں۔ حاتم رخصت ہوا۔

چند روز بعد ایک مقام پر رہبروں نے کہا کہ ہماری حد تمام ہو چکی ہے۔ یہ سرحد شہر قرطان کی ہے۔ حاتم ان کو رخصت کر کے آگے بڑھا۔ جب قریب پہنچا تو لوگ اس سے کہنے لگے کہ کس راہ سے آیا ہے؟ حاتم نے کہا کہ فلاں طرف سے، اگرچہ اس راہ میں بہت سی آفتیں تھیں، لیکن اللہ نے اس راہ کو اپنے کرم سے پاک کیا اور مجھے صحیح سلامت یہاں تک پہنچایا۔ یہ سن کر سب خوش ہوئے۔ حاتم شہر میں داخل ہوا اور سرائے میں اُترا۔ ایک دن دو بیش قیمت موتی اور دو لعل ایک ڈبیا میں رکھ کر بادشاہ کے پاس پہنچا۔ بادشاہ نے حاتم کو بلوا لیا۔ حاتم نے وہ جواہر نذر کیے۔ بادشاہ بڑا خوش ہوا، پوچھا: ''کہاں اُترے ہو؟''

اس نے کہا: ''سرائے میں۔''

بادشاہ نے کہا کہ ہماری خوشی ہے، ہمارے پاس رہو۔ حاتم وہیں آ رہا۔ چھے مہینے

اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن حاتم نے بادشاہ کو خوش و خرم دیکھا تو کئی لعل و زمرد پھر نذر کیے۔

بادشاہ نے کہا: ''اے جوان! ایک مدت سے تُو میری خدمت میں حاضر ہے، کچھ فرمایش نہیں کرتا۔ بے تکلف مانگ، بلا توقف تجھے دوں گا۔''

جب بادشاہ نے اصرار کیا تو حاتم نے کہا: ''حمام بادگرد کو دیکھنے کی آرزو ہے۔''
یہ سن کر بادشاہ متفکر ہوا۔ سر جھکائے چپ ہو گیا۔

حاتم نے پوچھا: ''اس قدر متفکر کیوں ہے؟''

بادشاہ نے کہا: ''مجھے کئی طرح کے اندیشے ہیں۔ پہلے تو میں نے قسم کھائی ہے کہ کسی کو حمام بادگرد کی طرف نہ جانے دوں گا۔ اگر تجھ کو جانے دوں تو عہد شکنی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ تجھ سا جوان اپنی جان سے ہاتھ دھوئے۔ تیسرے یہ کہ جیسا تُو ہے، ایسا جوان آج تک میرے پاس نہیں آیا۔ چوتھے یہ کہ اگر تجھے رخصت کروں تو جدائی کیوں کر سہوں۔''

تب حاتم نے منیر شامی اور حسن بانو کا قصہ بیان کیا اور کہا کہ اب یہی ایک سوال باقی رہ گیا ہے۔ آخر بادشاہ نے اپنے وزیر سے کہا: ''حمام بادگرد کے دربان ''سامان ارک'' کو خط لکھ کر اس کے حوالے کرو۔''

پھر حاتم کو گلے لگا کر رخصت کیا اور کئی آدمی ساتھ کیے۔ پندرہ روز کے بعد حمام نظر آنے لگا۔ حاتم نے پوچھا: ''یہ قلعہ ہے یا پہاڑ؟''

انھوں نے کہا: ''یہی حمام کا دروازہ ہے۔ نزدیک معلوم ہوتا ہے، مگر سات روز میں پہنچے گا۔''

ساتویں دن دروازے کے قریب جا پہنچے۔ حاتم نے دیکھا کہ پہاڑ کے دامن میں ایک بڑا لشکر پڑا ہے۔ پوچھا کہ یہ فوج کس کی ہے؟

ساتھیوں نے کہا: ''حمام بادگرد کے دربان کی۔''

حاتم، سامان ارک کے خیمے میں آیا۔ صاحب سلامت کر کے بادشاہ کا خط دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ اس جوان کے ساتھ میں نے عہد کیا تھا۔ اس لیے اس کو بھیجا ہے، اگر تُو اس کو سمجھا بجھا کر واپس کر دے تو ہم خوش ہوں گے اور یہ نہ مانے تو حمام بھجوا دے۔ چناں چہ اس نے حاتم کو سمجھانا چاہا۔ جب دیکھا کہ نہیں مانتا تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ حاتم کو دروازے پر لے گیا۔ حاتم نے دیکھا، دروازے پر خط سریانی میں لکھا تھا کہ یہ طلسمات کیومرس بادشاہ کے وقت میں بنا ہے۔ جو کوئی اس طلسمات میں جائے گا، جیتا نہ نکلے گا۔ اگر اس کی زندگی ہے تو ایک باغ میں وارد ہوگا۔ وہاں کے میوے کھائے گا، مگر باہر نہ نکل سکے گا۔

حاتم ہمت کر کے اندر چلا گیا۔ دس بارہ قدم چل کر جو پیچھے دیکھا تو دروازہ نظر نہ آیا، مگر ایک لق و دق جنگل تھا۔ متفکر ہو کر دروازہ تلاش کرنے لگا، پر دروازہ نہ ملا۔ چند روز بعد ایک طرف چل نکلا۔ تھوڑی دور گیا ہوگا کہ ایک آدمی کی صورت نظر پڑی۔ اُدھر چلا، وہ بھی اِدھر ہی کو آ گیا۔ جب نزدیک پہنچا تو اس طلسماتی صورت نے سلام کیا اور ایک آئینہ بغل سے نکال کر حاتم کو دیا۔ حاتم نے اس میں اپنا منھ دیکھا اور پوچھنے لگا کہ حمام یہاں سے نزدیک ہے؟ اور کیا تُو حجام ہے، جو آئینہ دکھاتا ہے؟ اس نے کہا: ''البتہ۔'' پھر حاتم نے پوچھا کہ تُو حمام کو چھوڑ کر کدھر جاتا ہے؟

وہ بولا: ''جس کسی کو دیکھتا ہوں، تو لے جا کر حمام میں نہلاتا ہوں۔ اگر آپ بھی چل کر غسل کریں تو آپ کی بدولت کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔''

آگے آگے حاتم پیچھے پیچھے نائی، چلے جاتے تھے۔ کچھ دور جا کر ایک گنبد نظر پڑا۔ حجام اندر گیا اور اس کو بلایا۔ حاتم جوں ہی داخل ہوا دروازہ بند ہو گیا۔ حجام اسے حوض پر لے گیا۔ حاتم لنگی باندھ کر حوض میں اُترا۔ حجام نے گرم پانی ایک ڈونگے میں بھر کر اسے دیا۔ اس نے سر پر ڈال لیا، اس نے پھر ڈونگا بھر کر دیا۔ حاتم نے پھر اسے اپنے اوپر ڈال لیا۔

تیسری مرتبہ جوں ہی سر پر ڈالا، کسی چیز کے پھٹنے کی ایک زوردار آواز ہوئی۔ حمام میں اندھیرا ہو گیا۔ ذرا دیر بعد تاریکی جاتی رہی تو کیا دیکھتا ہے کہ حمام ہے نہ حمام، نہ حوض ہے، ایک پتھر کا تراشا ہوا گنبد ہے۔ اس کا تمام صحن پانی سے بھرا ہوا ہے۔ ایک لحہ نہ گزرا تھا کہ پانی پنڈلیوں تک آ گیا، پھر بڑھ کر گھٹنوں تک پہنچا۔ تب حاتم گھبرایا۔ اتنے میں پانی ڈوبا ہو گیا۔ حاتم تیرنے لگا۔ غرض پانی اتنا بلند ہوا کہ اس کا سر گنبد سے جا لگا۔ ہاتھ پاؤں شل ہو گئے، قریب تھا کہ بیٹھ جائے، وہیں ایک زنجیر لٹکتی دکھائی دی۔ حاتم نے دونوں ہاتھوں سے اسے پکڑ لیا۔

اتنے میں پھر ویسی ہی آواز ہوئی۔ وہ گنبد کے باہر ہو گیا اور اپنے آپ کو ایک جنگل میں پایا، سوائے میدان کے کچھ دکھائی نہ دیا۔ خوش ہوا کہ اس طوفان سے نجات پائی اور طلسمات سے رہائی۔

آگے بڑھا، تین دن تک بھٹکتا پھرا، پھر ایک عمارت دکھائی دی۔ نزدیک جا کر دیکھا تو دروازہ کھلا پایا۔ اندر چلا گیا۔ کئی قدم بڑھ کر جو پھر دیکھا تو دروازے کا نشان نہ پایا۔ فکر ہوا کہ یہ کیا بلا ہے۔ مجبور ہو کر ایک طرف چلا۔ وہاں درخت پھلوں سے لدے تھے۔ بھوکا تو تھا ہی کھانے لگا، جتنا کھاتا، پیٹ نہ بھرتا۔ پھر سیر کرتا ایک بارہ دری کے قریب جا پہنچا۔ اس کے متصل بہت سے آدمی پتھر کے ننگے کھڑے تھے، مگر ایک ایک لنگوٹ باندھے تھے، وہ بھی پتھر کا۔ حیران ہوا۔ اسی فکر میں تھا کہ ایک توتی نے ہانک ماری:

’’اے جوان! کیوں کھڑا ہے؟‘‘

حاتم نے جو سر اُٹھایا تو ایک توتی پنجرے میں دیکھی اور یہ عبارت ایوان پر لکھی پائی:

’’اے بندۂ خدا! اس حمام بادگر سے سلامت نہ جائے گا کہ یہ طلسمات کیومرس بادشاہ کا ہے۔ ایک روز کیومرس بادشاہ شکار کھیلتا ہوا اِدھر آ نکلا تھا۔ اتفاقاً اس نے ایک ہیرا دیکھا۔ اُٹھا لیا۔ تلوایا تو تین سو مثقال (سونے کے سکے) وزن نکلا۔ حکیموں سے پوچھا کہ اس کا ثانی مل سکے گا۔ انھوں نے کہا کہ آدم کے وقت سے لے کر اب تک نہ ایسا دیکھا نہ سنا۔ تب اس نے کہا کہ لازم ہے کہ اس کو ایسی جگہ رکھوں، جو کسی کے ہاتھ نہ لگے۔ یہ سوچ کر حمام بادگر کا طلسمات بنایا اور اس توتی کو وہ ہیرا نگلا کر پنجرے میں رکھ کر یہاں لٹکا دیا اور اس کرسی جواہر نگار پر تیر کمان اس واسطے رکھ دیا کہ جو کوئی اس طلسمات میں آئے اور نکلنے کا قصد کرے تو یہ تیر کمان اُٹھا لے۔ اس توتی کے سر میں ایک تیر مارے۔ اگر لگا تو وہیں اس طلسم کے باہر ہوا اور ہیرا بھی اس نے پایا۔ نہیں تو پتھر کا ہو جائے گا۔‘‘

حاتم اس کو پڑھ کر ان بتوں کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ اگر اس طلسم سے نہ نکلا تو اپنی جان کھو دے گا۔ یہ خیال کر کے اس کرسی کے پاس گیا، بسم اللہ کہہ کر تیر کمان اُٹھا کر ایک تیر اسے لگا ہی بیٹھا۔ توتی پھڑک گئی۔ تیر اُڑ کر پنجرے کی چھت سے جا لگا۔ حاتم گھٹنوں تک پتھر کا ہو گیا۔ توتی جہاں بیٹھی تھی، وہیں آ بیٹھی اور بولی: ’’جا یہاں سے، یہ جگہ تیرے لائق نہیں۔‘‘

حاتم اُچھل کر تیر کمان سمیت سو قدم پیچھے جا پڑا۔ اپنی حالت پر آنسو بھر لایا اور کہنے لگا: ’’کس مشکل سے تُو یہاں تک پہنچا ہے۔ اب یہاں گھٹ گھٹ کر مرنا کیا معنی۔ اس سے بہتر یہی ہو گا کہ ایک تیر اور لگا۔‘‘ یہ سوچ کر دوسرا تیر مارا۔ اس بار بھی خطا کی اور ناف تک پتھر کا ہو گیا۔

توتی نے پھر کہا: ’’اے جوان! چلا جا۔‘‘ حاتم دو سو قدم اُچھل کر اب بتوں کے قریب پہنچا۔ زار زار رونے لگا۔ سوچنے لگا کہ ایک تیر جو رہ گیا، اس کو بھی لگا، چناں چہ اللہ اکبر کہہ کر وہ تیر مارا، وہیں توتی کی روح پرواز کر گئی اور پنجرے سے باہر نکل پڑی۔ اتنے میں ایک آندھی آئی، گھٹا اُٹھی، بجلی کڑکنے لگی۔ اندھیرا ہو گیا، شور غل ایسا بلند ہوا کہ حاتم بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ کچھ دیر بعد آندھی ہوا ہو گئی، ابر جاتا رہا، شور غل ختم ہوا۔ سورج نکل آیا۔

حاتم نے جو آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو بتوں کے برابر دیکھا۔ حواس بجا ہوئے تو دیکھا نہ وہ حمام ہے نہ باغ، نہ کرسی، نہ پنجرہ، نہ توتی، مگر ہیرا زمین پر پڑا چمک رہا ہے۔ حاتم اُٹھ کھڑا ہوا اور دوڑ کر اسے اُٹھا لیا۔ سجدۂ شکر ادا کیا۔ تب وہ سب کے سب آدمی ہو گئے۔ حاتم سے کہنے لگے: ”اے جوان! تُو کیوں کر سلامت رہا، وہ باغ کدھر گیا حمام کیا ہوا؟“

حاتم نے تمام سرگزشت کہی۔ قصہ مختصر، حاتم سب کو لے کر شہر قطان کی طرف چلا۔ تھوڑی دور چلا تھا کہ وہی دروازہ نظر آیا، جس سے داخل ہوا تھا۔ اس سے باہر نکلا تو سامان ارک کا لشکر دکھائی دیا؛ وہ اس کے دیکھتے ہی اُٹھا، بغل گیر ہوا۔ حاتم نے تمام واقعات بیان کیے۔ چند روز بعد شہر قطان میں داخل ہوا بادشاہ سے ملا اور وہ ہیرا دکھایا اور کہا: ”یہ بے چارے جو میرے ساتھ آئے ہیں، پتھر کے ہو گئے تھے۔ مہربانی فرما کر انھیں ایک گھر اور خرچ عنایت ہو تو اپنے اپنے وطن کو جائیں۔“

بادشاہ نے یہی کیا، پھر حاتم رخصت ہوا اور کئی مہینے کے بعد شاہ آباد میں داخل ہوا اور حسن بانو کے پاس پہنچا۔ اسے تمام واقعات سنائے، پھر ہیرا نکال کر دکھایا۔

حاتم نے کہا: ”میں نے اپنا وعدہ پورا کر لیا، اب تُو بھی وفا کر۔“ چناں چہ حسن بانو اور منیر شامی کی شادی کا انتظام کروایا۔ ان دونوں کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔

حاتم نے منیر شامی اور حسن بانو سے رخصت چاہی اور اپنے وطن یمن پہنچا۔ اپنے والدین سے ملا۔ محل میں خوشیاں منائی گئیں۔ بادشاہ نے ہر ایک کو خلعت دیا۔ غرض ان برس، سات مہینے اور نو روز میں حاتم کی ہفت سیر تمام ہوئی۔ منیر شامی اپنے مطلب کو پہنچا۔ آخر نہ یہ رہا اور نہ وہ رہا۔ ایک کہانی کہنے سننے کو رہ گئی۔

☆☆☆

نونہال خبر نامہ

تمیز و تہذیب کا کورس

چین میں بچوں کو آداب سکھانے کے لیے تمیز و تہذیب کا ایک کورس ترتیب دے کر اسے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ بچوں کے بگڑتے اخلاق کو سنوارنے کے لیے چین کے اسکولوں میں شروع کیے گئے اس کورس کو سیکھنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اس کورس کے ذریعے سے بڑوں سے بات کرنے کا طریقہ، گفتگو کا سلیقہ، کھانا کھانے کے آداب، مہذب انداز میں ای میل اور SMS کرنا بھی سکھایا جائے گا۔ وزارت تعلیم کا مقصد [illegible] ایک مہذب معاشرہ قائم کرنا ہے۔ ☆

دو زبانوں سے واقفیت سے صلاحیت میں اضافہ

ماہرین طب نے کہا ہے کہ دو زبانوں سے واقفیت تخلیقی قوتوں کو محفوظ بناتی ہے۔ دو یا دو سے زیادہ زبانوں پر عبور رکھنے والا فرد مختلف نوعیت کے کاموں کو بہتر انداز میں کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس تحقیق کے مطابق دوسری زبان اگر بڑی عمر میں بھی سیکھ لی جائے تو پھر بھی دماغی کارکردگی کو بہتر بناتی ہے۔ دو زبانیں جاننے والے افراد میں یادداشت کی کمی کی بیماری کی شرح ۳۰ فی صد دیکھی گئی اور اس کے بھی زیادہ تر امکانات بڑھاپے میں ہوتے ہیں، جب کہ ایک زبان جاننے والوں میں یہ شرح ۵۱ فی صد تھی۔ اس تحقیق کو انگریزی، روسی، چینی اور دیگر زبانیں جاننے والے لوگوں پر تجربات کے بعد مکمل کیا گیا۔ ☆

دنیا کا انوکھا قلم

عمرو عیار کی زنبیل کے بارے میں تو آپ نے یقیناً سنا ہوگا، جس میں دنیا کی ہر چیز موجود ہوتی تھی۔ یہ قلم بھی کچھ ایسا ہے، جس میں مختلف طرح کی کئی چیزیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ اس انوکھے قلم کے ساتھ کانٹا، چمچہ، اسکرو ڈرائیور، لیزر لائٹ، ٹوتھ برش، پیپر کٹر اور یو ایس بی ڈرائیو کے علاوہ کئی دیگر اوزار بھی موجود ہیں۔ قلم کے اگلے حصے میں یہ چیزیں نصب ہیں، جس سے لکھنے کے علاوہ بھی کئی کام لیے جا سکتے ہیں۔ ☆

بلند حوصلہ

مرزا اظفر [illegible]

کوڈی کی عمر صرف نو سال ہے۔ ایک غیر معمولی بیماری کے باعث اس کی دونوں ٹانگوں [illegible] پڑا، لیکن یہ لڑکا اتنا باہمت اور پُرعزم ہے کہ اس نے اپنی معذوری کو جان کا روگ نہیں بنایا۔ [illegible] پیرا اولمپکس کھیلوں کے مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے تیار ہے۔ ان عالمی مقابلوں میں گولڈ میڈل [illegible] اس کا خواب ہے اور وہ جلد از جلد اپنے خواب کو پورا ہوتا دیکھنا چاہتا ہے۔ شاید اسی لیے اس نے [illegible] ٹانگوں کے ۲۰ جوڑے بنوائے ہیں، تا کہ وہ ٹانگوں والے دیگر صحت مند نوجوانوں سے ہر کھیل میں [illegible] کر کے انھیں شکست دے سکے اور ساری دنیا پر یہ ثابت کر سکے کہ وہ معذور ہے، مجبور نہیں۔

کوڈی کے لیے جو مصنوعی ٹانگیں بنوائی گئی ہیں، ان کی کئی قسمیں ہیں۔ مثال کے طور پر اس [illegible] پاس ایسی مصنوعی ٹانگیں بھی ہیں، جو اسے دوڑنے میں مدد دیتی ہیں۔ عام انداز سے چلنے والی ٹانگوں [illegible] جوڑے الگ ہیں، جن کی مدد سے وہ چلتا پھرتا اور اسکول جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بیٹھنے والی ٹا[illegible] ہیں، جو اسے بیٹھے رہنے میں مدد دیتی ہیں۔ چناں چہ کوڈی ذرا دیر کے لیے بھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا، [illegible] کہ اس کے پاس ہر طرح کی ٹانگوں کی موجودگی نے اسے محرومی سے مکمل طور پر نجات دے [illegible] ہے۔ جب کوڈی پیدا ہوا تو اس کی ٹانگ کے گھٹنے اور ٹخنے کے درمیان کی اندرونی ہڈی غائب تھی، چنا[illegible] چہ جب وہ گھٹنوں گھٹنوں چلنے کے قابل ہوا تو اس کی ٹانگوں کے نیچے کا نصف حصہ کاٹ دیا گیا۔

جب نو سالہ کوڈی کو دوڑنے والی مصنوعی ٹانگیں لگائی گئیں تو اس کے بعد وہ اپنے قرب [illegible] کے علاقے میں تیز ترین دوڑنے والا کھلاڑی بن گیا۔ اب بھاگنے میں اس کا کوئی مد مقابل نہیں۔ کوڈی نے جنوبی افریقی کھلاڑی آسکر پس ٹوریس (OSCAR PISTORIUS) کو اپنا پسندیدہ تر[illegible] کھلاڑی قرار دیا ہے۔ اس نوجوان کھلاڑی کو بھی مصنوعی ٹانگیں لگائی گئی تھیں اور اس نے انھی ٹانگوں [illegible] کام یابی حاصل کی تھی۔

کوڈی کی ممی کا نام ٹینا ہے۔ ان کی عمر ۳۸ سال ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کوڈی کی دوڑنے [illegible]

کوڈی اپنے حاصل کیے ہوئے تمغوں کے ساتھ

مصنوعی ٹانگیں تیز دوڑنے میں اس کی مدد کرتی ہیں۔ وہ واقعی بہت تیز دوڑتا ہے اور اپنی عمر سے بڑے اور صحت مند بچوں کو دوڑنے کے مقابلوں میں ہراتا ہے۔ ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ کوڈی جو کچھ کرنا چاہے گا، ہم اُسے کرنے دیں گے، کبھی کسی کام سے نہیں روکیں گے اور اسے ہر موقعے سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیں گے۔ وہ اپنی اس معذوری کو اپنی محرومی یا نا اُمیدی نہیں بنائے گا اور اس کی وجہ سے زندگی کے کسی بھی شعبے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔

کوڈی کے لیے مصنوعی ٹانگوں کے یہ تمام جوڑے اور [illegible] کا تحفہ [illegible] کولے ول، [illegible]لساس میں واقع ایک مقامی اسپتال کی جانب سے دیا گیا ہے، جن کی مدد سے کوڈی کو مختلف کھیلوں میں حصہ لینے کا موقع ملے گا۔

کوڈی کے لیے جب مصنوعی ٹانگیں بنوائی جاتی ہیں تو اسے ہفتے میں چار گھنٹے کے لیے اسپتال [illegible] پڑتا ہے اور یہ سلسلہ آٹھ ہفتوں تک جاری رہتا ہے۔ اس دوران ڈاکٹر یہ دیکھتے ہیں کہ آیا اس کی

کوڈی اور اس کی مختلف انداز کی مصنوعی ٹانگیں

مصنوعی ٹانگوں کی پیمائش اور فٹنگ ٹھیک ہے یا نہیں۔

کوڈی کو سب سے زیادہ تیراکی پسند ہے، کیوں کہ یہاں اسے اپنی مصنوعی ٹانگوں کو استعمال نہیں کرنا پڑتا اور کھیل کے اس شعبے میں بھی اس نے اپنے سے زیادہ صحت مند اور زیادہ ماہر تیراک لڑکوں کو شکست دے کر کئی مرتبہ سونے اور چاندی کے میڈل حاصل کیے ہیں۔

کوڈی کی ممی ٹینا ایک سماجی کارکن ہیں۔ انھیں اُمید ہے کہ وہ کوڈی کو ساتھ لے کر ۲۰۱۲ء میں لندن میں منعقد ہونے والے پیرا اولمپکس کھیلوں کے موقع پر لندن جائیں گی۔

کوڈی بہت ہی کم ہونے والی ایک بیماری میں مبتلا ہے۔ یہ ریڑھ کی ہڈی کا مسئلہ ہے، جس میں ٹانگیں پھول کر غلط سمت میں مڑ جاتی ہیں۔

کوڈی کے باپ کا نام مائیک ہے۔ کوڈی کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے، جس کا نام کیلی ہے۔ جب کوڈی چھوٹا تھا تو اس کے والدین کو پہلے ہی خبردار کر دیا گیا تھا کہ کوڈی کی دونوں ٹانگوں کو کاٹا جا سکتا ہے، جس کے بعد ہی وہ مصنوعی ٹانگوں کے ذریعے سے چل سکے گا۔

ٹینا کا کہنا ہے: ''کوڈی کی دائیں ٹانگ میں TIBIA یعنی قصبۃ الکبریٰ اور گھٹنے کی گول ہڈی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ پنڈلی کی بیرونی ہڈی بھی اس قدر چھوٹی تھی کہ وہ کوڈی کی ٹانگ کو سہارا نہیں دے سکتی تھی اور گھٹنے کی ہڈی کے بغیر وہ اسے موڑ نہیں سکتا تھا۔ جب وہ بیٹھا ہوتا تو اس کی ٹانگیں پہلو میں مڑ جاتی تھیں اور یہ ایک طرح سے اس کے لیے رکاوٹ تھی۔ اس کی بائیں ٹانگ زیادہ نارمل دکھائی دیتی تھی، لیکن

کوڈی اپنی تین پہیوں والی سائیکل پر

یہاں بھی گھٹنا نہیں مڑتا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ اس بات کا امکان ہے کہ سرجری کے ذریعے سے ٹانگ کو ٹھیک کر دیا جائے، لیکن اس میں بھی کام یابی کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔''

کافی سوچ بچار کے بعد آخر کوڈی کے ممی ڈیڈی نے ایک جرات مندانہ فیصلہ کیا اور انھوں نے ڈاکٹروں کو کوڈی کی دونوں ٹانگیں کاٹنے کی اجازت دے دی۔ اس وقت کوڈی کی عمر صرف پندرہ ماہ تھی، لیکن جب دو ماہ بعد اسے پہلی بار مصنوعی ٹانگیں لگائی گئیں تو کوڈی نے اپنے ممی ڈیڈی اور اپنے ڈاکٹروں کو حیرت زدہ کر دیا۔ وہ اسی روز ہمت اور کوشش کر کے نہ صرف کھڑا ہو گیا بلکہ اس نے ان ٹانگوں کی مدد سے چلنا بھی شروع کر دیا۔ ٹینا کا کہنا ہے: ''مصنوعی ٹانگوں سے کوئی بھی فرد ایک دم اتنی عمدگی سے نہیں چل سکتا، جتنی عمدگی سے کوڈی چل رہا تھا۔ یہ بہت خوشی اور حیرت کی بات تھی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ بہت خوش تھا۔''

ٹینا کہتی ہیں: ''یہ مصنوعی ٹانگیں بہت مہنگی ہیں اور کوڈی کو اس کا بہت احساس ہے، اسی لیے وہ ان کا بہت خیال رکھتا ہے۔ ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ ہمیں اس اسپیشلسٹ سینٹر کی مدد مل گئی، جو دوڑنے والی ٹانگیں فراہم کرتا ہے۔''

بہادر اور پُرعزم کوڈی کا کہنا ہے: ''میں ایک ایسا دوڑنے والا کھلاڑی ہوں جو راستے میں کبھی تھک کر رکتا نہیں، اس لیے دوڑنے میں میری برابری کوئی نہیں کر سکتا۔''

☆☆☆

میں تمھارا دماغ ہوں

شہید حکیم محمد سعید

نونہالو! میں انسانی جسم کی سلطنت کا بادشاہ ہوں۔ کھوپڑی کے چھوٹے سے محل میں رہتا ہوں، لیکن حکم اور اختیار میں دنیا کا کوئی بادشاہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ آج کل کی زبان میں، میں انسانی بدن کی واحد سپر پاور ہوں۔ تمھارے دل کا دھڑکنا، سانس لینا، کھانا ہضم کرنا، سوچنا سمجھنا، ہنسنا رونا، یہ سب کام قدرت نے میرے اختیار میں دے رکھے ہیں۔

نونہالو! اگر تم اپنی جماعت کے ذہین طالب علم ہو تو یہ ذہانت میں تمھیں دیتا ہوں۔ جب کھیلوں میں گھوڑے کی طرح ریس لگاتے ہو تو یہ رفتار میں تمھیں بخشتا ہوں۔ جب خوشی میں تمھارا چہرہ دمکتا ہے تو یہ پھول میں کھلاتا ہوں۔ جب تم نیند میں اُڑن کھٹولے پر سوار دنیا کی سیر کرتے ہو تو یہ خواب میں تمھیں دکھاتا ہوں اور جب تم میں سے کوئی نیک بخت قرآن مجید حفظ کر لیتا ہے تو یہ حافظہ میں تمھیں دیتا ہوں۔

میرا وزن ۳ پونڈ (ایک اعشاریہ ۴ کلوگرام) ہے۔ میں گریپ فروٹ کے سائز کا ہوں۔ میرا اوپر کے حصے کا رنگ خاکستری (GREY) ہوتا ہے اور اندرونی حصے کا رنگ سفید۔ اہم بات یہ ہے کہ باقی اعضا کے خلیات نئے بنتے رہتے ہیں، لیکن میرے خلیات کا جو حصہ ایک بار مردہ یا ضائع ہو جائے، وہ نیا نہیں بن سکتا، البتہ یہ ہوتا ہے کہ ایک حصے کا کام کوئی دوسرا حصہ سنبھال لیتا ہے۔

جسم کے دوسرے حصوں کی طرح میری غذا بھی خون ہے۔ اس میں اہم چیز آکسیجن ہے۔ اگر مجھے چند منٹ تک آکسیجن نہ ملے تو میں اپنا کام جاری نہیں رکھ سکوں گا اور پھر میرے حکم پر جسم کے اندر جتنے کام ہو رہے ہیں، وہ سب بند ہو جائیں گے۔

میرا تمام کام اعصاب کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ اعصاب، عصب کی جمع ہے۔

اعصاب ان نسوں کو کہتے ہیں، جن کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے۔ سر سے لے کر ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کی پوروں تک بدن کا ہر حصہ اعصاب کے جال کے ذریعے سے دماغ سے جڑا ہوا ہے۔ کچھ اعصاب وہ ہیں جو سونگھ کر، دیکھ کر، چکھ کر، سن کر اور ہاتھ لگا کر کسی بات کا پتا لگاتے ہیں مثلاً کسی گرم چیز کا احساس یا پھسل کر گرنے کا خطرہ۔ وہ فوراً یہ خبر دماغ تک پہنچاتے ہیں۔ دماغ دوسری قسم کے اعصاب کے ذریعے سے فوراً ہدایات بھیجتا ہے کہ گرم چیز کو ہاتھ نہ لگاؤ یا پھسلنے کا خطرہ ہے تو توازن برقرار رکھو اور ساتھ ہی یہ احتیاط بھی کرو کہ اگر پھسل پڑو تو کسی نازک عضو کو چوٹ نہ لگے۔

نونہالو! تمھارے جسم کا وہ حصہ جہاں اعصاب اپنی حاصل کردہ معلومات پہنچاتے ہیں اور پھر ان کا جواب لاتے ہیں، مرکزی عصبی نظام (CENTRAL NERVOUS SYSTEM) کہلاتا ہے۔ یہ نظام دماغ اور نخاع پر مشتمل ہوتا ہے۔ نُخاع (حرام مغز) وہ ڈوری ہے، جو دماغ سے نکل کر ریڑھ کی ہڈی کے اندر سے گزر کر نیچے تک جاتی ہے۔

اس کے علاوہ کچھ اور بھی نظام ہیں مثلاً دل، پھیپڑا اور معدہ جو ہر وقت خود بہ خود کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کا ایک خود کار عصبی نظام (AUTONOMOUS NERVOUS SYSTEM) ہے۔ بعض اعضا کے کام کی رفتار تیز یا کم کرنے کے نظام بھی ہیں۔ یہ تمام نظام ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طریقے سے جڑے ہوئے ہیں۔

دنیا کا بڑا سے بڑا اور بہترین کمپیوٹر بھی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کمپیوٹر تو تب چلتا ہے، جب اس میں پروگرام ڈالا جاتا ہے۔ میرے اندر تمام پروگرام قدرت نے پہلے سے ڈال رکھے ہیں۔ کمپیوٹر نہ تو بور ہوتا ہے نہ آرام کر سکتا ہے، نہ وہ خوش ہو سکتا ہے نہ ہنس سکتا ہے، نہ اسے غیب سے کوئی نئی بات سوجھتی ہے اور نہ ایجاد کر سکتا ہے، مگر میں یہ تمام کام کر سکتا ہوں۔

دماغ کا یہ حصہ عضلات کو کنٹرول کرتا ہے۔
چلنے، بھاگنے اور دوسری حرکات میں توازن رکھتا ہے

جب سے دنیا بنی ہے، ماہرین میرے راز معلوم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن انھیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ انھیں اتنا معلوم ہوا ہے کہ میرے دو حصے ہیں، دایاں حصہ اور بایاں حصہ۔ میرا بایاں حصہ بدن کے دائیں حصے کو کنٹرول کرتا ہے اور دایاں حصہ، بدن کے بائیں حصے کو کنٹرول کرتا ہے۔ اسی طرح میرا بایاں حصہ بولنے، لکھنے اور حساب کرنے کی مہارتوں کو کنٹرول کرتا ہے اور دایاں حصہ پہچان (تمیز)، سوچ (خیال) اور قوتِ فیصلہ کو کنٹرول کرتا ہے۔

جب تم سوتے ہو، تب بھی میں ہر وقت کام کرتا رہتا ہوں۔ میرے لیے کوئی آرام نہیں۔ ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ انسان اپنے دماغ سے صرف پندرہ فی صد کام لیتا ہے۔ اب تم خود ہی سوچو کہ میں پندرہ فی صد کام کرتا ہوں تو تم اس کام کو بھی حیرت انگیز

کہتے ہو۔ اگر میں سو فی صد کام کروں تو پھر کیا ہوگا۔

انسان ایک فانی مخلوق ہے۔ اس کی عمر کی ایک حد مقرر ہے۔ غلط غذا اور زہریلی چیزیں اس کی صحت میں خلل ڈالتی ہیں اور وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ میں جو تمھارا دماغ ہوں، مجھ پر بھی کئی بیماریاں حملہ کرتی ہیں۔ کبھی کسی زہریلی چیز کے اثر سے میرے اندر رسولی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر آپریشن سے اس کا نکالنا ممکن ہو تو اسے نکال دیا جاتا ہے۔

میری ایک بیماری کو الزائمر (ALZHEIMER) کی بیماری کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ ۶۰ سال سے زیادہ عمر کے لوگوں میں ہوتی ہے۔ پہلے ان کی یادداشت خراب ہوتی ہے، پھر وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ جوتے کا تسمہ کیسے باندھا جائے، گاڑی کیسے چلائی جائے، کھانا کیسے کھایا جائے۔ اس مرض کی اصل وجہ معلوم نہیں، لیکن یہ ہوتا بڑھاپے میں ہے۔

کچھ نفسیاتی بیماریوں کا تعلق بھی مجھ سے ہے۔ مثلاً خواہ مخواہ کا وہم، خوف، پریشانی، غیب سے آوازوں کا سنائی دینا، یہ سمجھنا کہ کوئی شخص میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔

نونہالو! اگر تم میری قدر کرو، میری صحت کا خیال رکھو، میری قوتوں سے پورا پورا کام لو تو تم بھی ابنِ سینا، آئن سٹائن، امام غزالی، قائداعظم اور ڈاکٹر علامہ اقبال بن سکتے ہو۔ یاد رکھو، میں ہی تمھاری شخصیت اور تمھاری خودی ہوں۔ تم خلوص اور لگن سے پڑھائی میں لگ جاؤ تو ان شاء اللہ کامیابی تمھارے قدم چومے گی۔ ☆

بعض نونہال پوچھتے ہیں کہ رسالہ ہمدرد نونہال ڈاک سے منگوانے کا کیا طریقہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی سالانہ قیمت منی آرڈر یا چیک سے بھیج کر اپنا نام پتا لکھ دیں اور یہ بھی لکھ دیں کہ کس مہینے سے رسالہ جاری کرانا چاہتے ہیں، لیکن چوں کہ رسالہ کبھی کبھی ڈاک سے کھو بھی جاتا ہے، اس لیے ہمارا مشورہ ہے کہ یا تو اخبار والے سے کہہ دیں کہ وہ ہر مہینے ہمدرد نونہال پہنچا دیا کرے ورنہ اسٹالوں اور دکانوں پر بھی ہمدرد نونہال ملتا ہے۔ وہاں سے ہر مہینے خرید لیا جائے۔ اس طرح پیسے بھی اکھٹے خرچ نہیں ہوں گے اور رسالہ بھی جلد مل جائے گا۔

ہمدرد فاؤنڈیشن، ہمدرد ڈاک خانہ، ناظم آباد، کراچی

نئی کہانی

جدون ادیب

عامر شیرازی نے اپنی ادبی زندگی میں بے شمار کہانیاں لکھی تھیں۔ وہ ایک مشہور اور کام یاب لکھاری تھا۔ اسے نیکی اور بدی کی کش مکش اور کرداروں کے عروج اور زوال پر کہانیاں لکھنے میں مہارت حاصل تھی۔ وہ اپنی کہانی کے کرداروں کو اپنی مرضی سے عروج پر لے جاتا تھا اور اُن کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ اور اختتام کا فیصلہ وہ خود کرتا تھا۔ وہ اپنے تخلیق کردہ کرداروں کی قسمت سے کھیلتا تھا، مگر پھر قسمت اس سے کھیلنے لگی اور وہ خود پستی میں گر چلا گیا۔ اس نے دوبارہ عروج حاصل کرنے کی کوشش کی اور ہر حربہ آزمایا، مگر ناکام رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے قسمت اس سے روٹھ چکی ہے اور وہ قسمت کے آگے بے بس ہو کر رہ گیا۔

اس نے ایک ڈائجسٹ رائٹر کے طور پر شہرت پائی، پھر ٹی وی چینلوں کی بھرمار آئی اور اس نے دیکھا کہ ٹی وی ڈرامے لکھنے والے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہیں تو وہ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے لگا۔ شروع شروع میں اسے بے تحاشا کام ملا۔ اس وقت معیار کا کوئی مقابلہ نہیں تھا، پھر ناظرین روایتی اور یکسانیت سے بھرے ڈرامے دیکھ کر بور ہو گئے اور پروڈیوسر نئے اور اچھوتے موضوعات کی تلاش اور فرمائش کرنے لگے۔ مقابلے کی فضا بنی تو پہلے سے لکھنے والوں کے لیے زیادہ مشکلات کھڑی ہو گئیں۔ ہر پروڈیوسر اچھوتا خیال مانگنے لگا۔ عامر شیرازی جس موضوع پر کہانی لکھتا، اسے کوئی نہ کوئی پروڈیوسر پرانا خیال کہہ کر مسترد کر دیتا۔ رفتہ رفتہ اس کے پاس کام ختم ہو گیا، مسلسل ناکامیوں نے اس کا مزاج چڑچڑا کر دیا۔ ہاتھ تنگ ہوا تو وہ بد مزاج ہو گیا اور اس کے دوست اور خیر خواہ اس سے کترانے لگے۔ آخر جمع پونجی ختم ہو گئی اور نوبت قرضے اور غربت تک پہنچ گئی۔

عامر شیرازی نے مایوسی میں بہت دن گزارے، پھر اس نے سوچا کہ ایک کہانی ہی اسے ان خراب حالات سے باہر نکال سکتی ہے، تب اس نے ایک دکھ بھری کہانی لکھی۔ کہانی لکھتے وقت اس کی آنکھیں بار بار بھر آتی تھیں۔ کہانی مکمل ہوئی تو اسے یقین ہو گیا یہ کہانی اسے دوبارہ عروج عطا کرے گی اور وہ مشکل حالات سے نکل آئے گا۔

عامر شیرازی کو اپنی نئی کہانی سے بہت امیدیں وابستہ تھیں، مگر جب وہ یہ کہانی لے کر مختلف ٹی وی چینل گیا تو اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ کوئی پروڈیوسر اس کی کہانی کو وہ اہمیت نہیں دے رہا جو ملنی چاہیے تھی۔ ان کے رویوں میں سرد مہری تھی۔ اس کہانی نے بھی اسے مایوس کر دیا۔ آخری امید کے طور پر وہ ہاشمی پروڈکشن ہاؤس پہنچا، جس کا نوجوان مالک عطا ہاشمی نئے موضوعات کی تلاش میں رہتا تھا اور ہمیشہ نئے اور منفرد موضوعات پر ڈرامے بناتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے ہی مطمئن ہوتا تھا، مگر پیسے اچھے دیتا تھا اور اس کی اپنی ایک ساکھ تھی۔

عامر شیرازی، عطا ہاشمی کے دفتر پہنچا تو وہ بہت جلدی میں لگ رہا تھا۔ اس نے سلام دعا کے بعد عامر شیرازی کے لیے چاے منگوائی اور چپڑاسی سے کہا کہ چاے جلدی لائے، کیوں کہ اسے کہیں جانا ہے۔

عامر شیرازی اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اس نے بغیر تمہید کے کہا: ''ہاشمی! میں تمھارے لیے دکھوں اور آنسوؤں سے لبریز ایک بہت خاص کہانی لایا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ یہ میری زندگی کی سب سے اہم کہانی ہے اور شاید آخری بھی!''

''آخری! کیا مطلب؟'' عطا ہاشمی نے چونک کر پوچھا۔

''میں نے یہ کہانی بہت دل سے لکھی ہے۔'' عامر شیرازی شکستہ لہجے میں بولا: مجھے نہیں لگتا کہ اس کی ناکامی کے بعد میں اس جیسی کوئی اور کہانی لکھ پاؤں گا۔ مجھے اپنے

چاروں طرف اندھیرا نظر آرہا ہے۔ یہ کہانی مجھے روشنی دے سکتی ہے۔''

عطا ہاشمی نے عجیب سی نظروں سے اس کی جانب دیکھا، پھر گہرا سانس لے
بولا: ''اوکے! میں فرصت سے اسے پڑھوں گا، پھر کوئی حتمی بات کرسکوں گا۔''

عامر شیرازی کو اس کے انداز میں گرمجوشی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ دل شکستہ ہو
لوٹ آیا۔ کچھ دن کے بعد اس نے عطا ہاشمی کو اپنی کہانی کے بارے میں فون کیا اور پھر
دن تک اسے یاد کراتا رہا، مگر وہ مسلسل ٹالتا رہا۔ تب عامر شیرازی سمجھ گیا کہ وہ ناکام ہو
ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کی ادبی زندگی کا اختتام آچکا ہے۔ اس نے چند روز مزید انت
کیا، مگر عطا ہاشمی نے اسے فون نہیں کیا۔ اب وہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ اس سے رابطہ کر
نہیں کرنا چاہتا۔ شدید مایوسی کی حالت میں سویا تو اس نے ایک خواب دیکھا۔ اس
دیکھا کہ دن کا وقت ہے۔ ایک چوک میں کچھ لڑکے ایک لڑکے کو مار رہے ہیں۔ وہ اس
لڑکے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ لڑکے اس پر پل پڑتے ہیں اور اسے مارتے ہیں
اسی اثنا میں موٹر سائیکل پر چند نوجوان وہاں پہنچتے ہیں اور اسے بچا کر ان لڑکوں کو قابو میں
کر لیتے ہیں اور انھیں سزا دینے کے لیے اپنے ٹھکانے کی طرف گھسیٹتے ہیں۔ یہ منظر بہت
سارے لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں، مگر کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ عامر شیرازی اپنی جان بچ
پر خوش ہوتا ہے، مگر اپنا بدلہ لینے کے لیے نوجوانوں کے پیچھے لپکتا ہے۔ اسی وقت اس کی
آنکھ کھل جاتی ہے۔

عامر شیرازی جاگا تو پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ خواب
اور اسے جو مار پڑی تھی، وہ خواب میں پڑی تھی۔ پھر اس نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا
کچھ تبدیلیوں کے بعد یہ ایک کہانی بن سکتی ہے۔ اس نے سوچا کہ یہ کہانی ہر سیر کو سوا
یا جیسا کرو گے ویسا بھرو گے، جیسے موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔

وہ بہت دیر تک سوچتا رہا کہ اس خواب کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسا تو
نہیں کہ یہ کوئی الہامی کہانی ہو۔ اسے خیال آیا کہ وہ یہ طے کر چکا تھا کہ اگر اس کہانی پر ڈراما
نہ بنا تو وہ نئی کہانی نہیں لکھے گا اور شاید قدرت نے خواب کے ذریعے سے اسے ایک کہانی کا
تحفہ دیا ہے۔

وہ دیر تک سوچتا رہا۔ اس کا دماغ سوچوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اس کا ذہن کئی
طرح کی باتیں سوچ رہا تھا اور پھر خود ہی وہ ان باتوں کو مسترد کر دیتا۔ سوچتے سوچتے ایک
خیال بجلی کی طرح اس کے دماغ میں کوندا۔ اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ جو خدا خواب
میں بھی اس کی غیبی مدد کرتا ہے، کیا وہ اصل زندگی میں اس کی مدد نہیں کرے گا......!

اس لمحے عامر شیرازی کو احساس ہوا کہ وہ خدا سے مایوس ہو چکا تھا اور اس نے
اپنی مشکلات کے خاتمے کے لیے خدا سے رجوع نہیں کیا تھا، مگر آج اسے نہ صرف خواب
میں دیکھی گئی کہانی کا عنوان مل گیا تھا بلکہ خدا کی طرف پلٹنے کا ایک موقع بھی مل گیا تھا۔ وہ
مطمئن اور طاقت ور سوچ کے ساتھ اُٹھا۔ وضو کر کے اس نے سجدۂ شکر ادا کیا، بارگاہِ الٰہی
میں اپنی کوتاہیوں پر معافی مانگی، اپنے لیے دعا مانگی اور پُرسکون نیند سو گیا۔

صبح جب وہ اُٹھا تو اس نے اپنے آپ کو بہت پُراعتماد محسوس کیا۔ اسے خدا کی مدد
حاصل تھی، اس سوچ نے اسے توانائی دی۔ وہ بغیر اطلاع کے عطا ہاشمی کے دفتر میں پہنچا اور
اسے بتایا کہ وہ اپنی کہانی واپس لینے آیا ہے، تاکہ کسی اور جگہ دے سکے۔ اس نے عطا ہاشمی کو
یقین دلایا کہ وہ اس کے لیے ایک نئی کہانی لکھے گا، کیوں کہ لکھاری کی آخری کہانی کوئی نہیں
ہوتی، ہر روز ایک نئی کہانی کا ہوتا ہے اور وہ روز ایک نئی کہانی لکھے گا۔

عطا ہاشمی نے اس کے بدلے ہوئے انداز کو محسوس کیا۔ وہ اس کی کہانی کے
حوالے سے گومگو کیفیت میں تھا۔ اسے کہانی اچھی لگی تھی اور اس کی اپنے ڈائرکٹر سے بات

بھی ہوئی تھی، مگر اسے عامر شیرازی کا مایوسی کا انداز پسند نہیں آیا تھا اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ عامر شیرازی خود اپنی کہانی کے لیے سو فی صد پُر امید نہیں لگتا تو کیا اس پر سرمایہ کاری مناسب رہے گی، مگر اب وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے میز کی دراز کھولی۔ عامر شیرازی سمجھا کہ وہ کہانی نکال کر اسے دینا چاہتا ہے، مگر اس نے چیک بک نکال کر سامنے رکھی اور مسکرا کر بولا: ”تمھیں کتنا ایڈوانس چاہیے اور تم کتنے عرصے میں اس کی ساری قسطیں لکھ کر دے سکتے ہو!“

عامر شیرازی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ عامر شیرازی بھی مسکرایا: ”میں تم سے سودے بازی نہیں کروں گا، کیوں کہ تم بہت سمجھدار انسان ہو۔“

تھوڑی دیر بعد وہ عطا ہاشمی کے دفتر سے باہر نکلا تو ایک بھاری رقم کا چیک اس کی جیب میں موجود تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ خواب کے ذریعے سے زندگی بدلنے کا خیال کتنا پرانا اور عام ہے، مگر اس کے لیے یہی سب سے بہترین کہانی ثابت ہوئی ہے۔ اس کہانی نے گویا اسے نئی زندگی عطا کی تھی۔ ☆

شعر اور شاعر

مشہور شاعر جگر مراد آبادی سے کسی نے اچھی اور بُری شاعری کے بارے میں پوچھا تو جگر مراد آبادی نے جواب دیا: ”صاحب! کسی اچھے شاعر کو سزا ملتی ہے تو اس کے منھ سے کوئی گھٹیا شعر نکل جاتا ہے اور کسی اچھے شعر کو سزا ملتی ہے تو کسی گھٹیا شاعر کے منھ سے ادا ہو جاتا ہے۔“ ☆

باغبانی - ایک مفید مشغلہ

نسرین شاہین

قدرت نے پھولوں اور پودوں کی صورت میں ہمیں بہت خوب صورت نعمتوں سے نوازا ہے۔ یہ قدرت کی طرف سے ہمارے لیے عظیم تحفہ ہیں۔ پھولوں اور پودوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ جس جگہ موجود ہوں، زمین کا وہ حصہ خوب صورت ہو جاتا ہے۔ پودے آکسیجن خارج کرتے اور ہائیڈروجن جذب کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی اپنے گھر کو خوب صورت بنانے کے لیے کم از کم ایک پودا ضرور لگائیں۔

باغ بانی ایک مفید مشغلہ ہے۔ اگر آپ کے گھر میں کچی زمین کا تھوڑا سا حصہ موجود ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے، کیوں کہ پودا لگانے کے لیے ایسی ہی زمین کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر آپ کے گھر میں کچی زمین کا حصہ نہیں ہے تو کوئی بات نہیں گملوں میں بھی پودے لگائے جا سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایسے گملوں کا انتخاب کریں جن کے پیندے میں سوراخ ہو، تاکہ پانی کا اخراج ہو سکے۔ اگر گملے میں پانی جمع رہے گا تو وہ پودے کی جڑوں کو نقصان پہنچائے گا اور پودا قبل از وقت مرجھا جائے گا۔

گملے کے انتخاب کے بعد اب ان میں مٹی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ مٹی آپ قریبی نرسری سے خریدیں، جو کئی طرح کی مٹی اور کھاد کا مرکب ہوتی ہے۔ کوشش کر کے ایسی مٹی خریدیں کہ جس کے بعد دیکھ بھال کی ضرورت کم سے کم ہو اور وہ دیر تک چلے۔ اب پودے کا انتخاب کریں۔ درست جگہ پر درست پودا لگانے سے ہی آپ کا مقصد پورا ہو گا۔ نرسری جا کر مختلف پودوں کے بارے میں معلومات حاصل کریں، تاکہ آپ کو پتا چل سکے کہ کس پودے کو آپ آسانی کے ساتھ گملے میں لگا سکتے ہیں اور کس پودے کو کتنی دھوپ اور

چھاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک گملے میں ایک ہی پودا لگائیں۔ پودے کی جڑ کو اچھی طرح سے مٹی میں دبائیں۔ پودے کی جڑ زیادہ مٹی میں ہو اور اس کا تنا اور شاخیں باہر نکلی ہونی چاہییں۔ گملے میں اس قدر مٹی ڈالیں کہ گملے کے کنارے اور مٹی کے بیچ ایک انچ کا فاصلہ ہو یعنی ایک انچ خالی ہو۔ اب گملے میں پانی ڈالیں۔ اس طرح جڑ اپنی جگہ پر درست طریقے سے جم جائے گی۔

پودوں میں پانی دینے کا بہترین وقت صبح اور شام ہے۔ بڑے پودوں کو دن میں ایک بار پانی دینا کافی ہے۔ پودے میں پانی اتنا ڈالیں کہ پانی گملے کے سوراخ سے بہنے لگے۔ اس طرح آپ کو پتا چل جائے گا کہ مٹی نیچے تک گیلی ہو چکی ہے۔ پانی مٹی کو دیں، پتوں اور پھولوں کو نہیں۔ ایسی صورت میں پتے اور پھول فنگس (FUNGUS) کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان پر دھبے پڑ جاتے ہیں۔ اگر دوپہر کے وقت پودے اور پھول مرجھائے ہوئے نظر آئیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تک مٹی کا اوپری حصہ نم ہے، پانی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ پودوں میں قدرتی حفاظتی انتظام ہے، جس میں پودے مرجھا کر اپنی نمی کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہ مرجھائے سے لگتے ہیں، مگر مرجھائے ہوئے نہیں ہوتے ہیں۔ گملے میں پانی اتنا نہ بھریں کہ وہ مٹی کے اوپر تک تیرتا رہے۔ اس سے پودے کی جڑیں خراب ہو جائیں گی۔

اس بات کا خیال رکھیں کہ گملے میں لگائے گئے پودے کو زمین پر لگے پودے کے مقابلے میں زیادہ کھاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر آپ کی خواہش ہے کہ آپ کا لگایا ہوا پودا خوب پھلے پھولے اور ہرا بھرا رہے تو دو ہفتے کے بعد اس میں مٹی ڈالیں۔ پودوں کو کاٹ چھانٹ کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اس سے پودے اور زیادہ پھل پھول دیتے ہیں۔ کاٹ چھانٹ کے بعد پودا زیادہ خوش نما لگتا ہے۔ بعض پودے کاٹ چھانٹ کا عمل خود ہی کرتے ہیں یعنی انھیں کاٹ چھانٹ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ ان میں عموماً چھوٹے چھوٹے پھول اُگتے ہیں اور خود ہی جھڑ کر گر جاتے ہیں۔ ان کے لیے ظاہر ہے کہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔

باغبانی ہر موسم میں بچوں کے لیے ایک بہترین مشغلہ ہے۔ آپ وہی پودا لگائیں جو آسانی سے اُگ سکے۔ آپ جس وقت پودا لگاتے ہیں، اس سے چار پانچ ہفتے قبل جس زمین یا گملے پر پودا لگانا ہو، اس کی مٹی، کھاد، بیج اور پانی دینے کے عمل کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ زمین کے ایک چھوٹے سے حصے سے شروعات کریں۔ بیجوں کو زمین پر بونے سے قبل ان کو دھوپ میں سکھا کر سخت کر لیں۔ سارا دن ان کو دھوپ میں رکھیں اور رات کو اٹھا کر اندر لے آئیں۔ یہ عمل ایک ہفتہ کریں۔ جب بیجوں کو زمین پر یا گملے میں ڈال دیں تو پھر یہی عمل الٹا کریں یعنی گملوں کو ٹھنڈی جگہ پر رکھیں۔ اگر ان کو گرم جگہ پر رکھا گیا تو یہ مرجھا جائیں گے۔ بیج بونا اصل میں سیکھنے اور سکھانے کا بہترین طریقہ ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ پودا کیسے اُگتا ہے اور اس کی دیکھ بھال کیسے کی جاتی ہے۔ اس مشاہدے اور تجربے کے بعد آپ اور آپ کے دوست باغبانی کا عمل اچھی طرح اور دل چسپی کے ساتھ کر سکیں گے۔ یقیناً آپ ایسے پودے لگانا پسند کریں گے جو جلدی اُگ آتے ہیں اور ان میں پھل، پھول اور سبزی بھی جلدی آ جائے۔ جب آپ اپنے لگائے ہوئے پودے میں پھول اور پھل آتے دیکھیں گے تو یہ لمحہ آپ کو ایک ایسی خوشی دے گا، جو آپ کو بہت عرصے تک یاد رہے گی۔ آپ خود بھی باغبانی کریں اور اپنے دوستوں کو بھی اس طرف راغب کریں۔ بلاشبہ باغبانی مفید مشغلہ ہے۔

☆

آج سدِ باب نہیں تو کل علاج نہیں

ہمدرد نونہال اسمبلی، راولپنڈی .... رپورٹ، حیات محمد بھٹی

اس بار ہمدرد نونہال اسمبلی کا موضوع تھا:
"آج سدِ باب نہیں تو کل علاج نہیں"

راولپنڈی کے اجلاس کی صدارت جناب شہزاد عالم خان (نیشنل پروگرام آفیسر عالمی ادارۂ صحت) نے کی۔ مہمانِ خصوصی جناب مظہر نثار (ایڈوائزر ہیلتھ ایجوکیشن وزارتِ صحت، حکومت پاکستان) تھے۔ تلاوتِ کلامِ پاک نونہال سید عمیر شاہ نے کی، حمد باری تعالیٰ نونہال محمد طاہر مرزا نے سنائی۔ نعتِ رسولِ مقبول نونہال شیما حسن نے پیش کی۔ اسپیکر نونہال لاریب امجد تھیں۔ نونہال مقررین میں عابد علی، جاوید خان، عیشہ حنیف، گل حیدا، اقرا انور شامل تھے۔ سبھی نونہالوں نے مدلل اور بہت عمدہ، پُر اثر تقریریں کیں۔

قومی صدر نونہال اسمبلی محترمہ سعدیہ راشد نے کہا کہ پوری دنیا اس وقت ایک ایسے مسئلے سے دوچار ہو رہی ہے جس کا مؤثر اور منظم تدابیر کے ذریعے فوری تدارک نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ مسئلہ مستقبل قریب میں انتہائی پریشان کن صورتِ حال کا سبب بن جائے گا۔ طبی سائنس کی تیز رفتار ترقی نے ساری دنیا کو حیران بھی کیا ہے اور کسی حد تک پریشان بھی۔ ایسے ایسے خطرناک اور مہلک امراض کا علاج ممکن ہوا ہے، جس کے بارے میں کچھ عرصہ قبل سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا اور اس سلسلے میں تحقیقی پیش رفت کا عمل مسلسل جاری ہے۔ جراثیم کش ادویہ (ANTIBIOTICS) انھی تحقیقات کا نتیجہ ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں تقریباً حادثاتی طور پر ایک دوا پنسلین (PENICILLIN) دریافت ہوئی اور پھر اس کی ترقیاتی صورتوں نے معجزے کر دکھائے۔ ضروری تھا کہ ان ادویہ کے استعمال میں حد درجہ احتیاط

برتی جاتی اور سود مند بنے دیا جاتا، لیکن اس کے برعکس ان کے غیر ضروری، بے موقع اور مجوزہ مقدار و مدت سے کم، زیادہ استعمال نے انسانی جسم میں موجودہ جراثیم کے اندران ادویہ کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا کر دی۔ ہم سب کو مل کر اس غلط رجحان کا تدارک کرنا ہوگا۔ عالمی یومِ صحت (۷۔ اپریل ۲۰۱۱ء) کے موقعے پر عالمی ادارۂ صحت (WHO) نے اس سال اسی اہم مسئلے کو غور و فکر کا موضوع بنایا ہے۔ حسبِ روایت ادارہ ہمدرد اس مہم میں عالمی ادارۂ صحت (WHO) کے ساتھ ساتھ ہے۔

ہمدرد نونہال اسمبلی راولپنڈی میں محترم مظہر نثار، محترم شہزاد عالم خان اور نونہال تقریر کر رہے ہیں۔

تقریب کے صدر محترم ڈاکٹر شہزاد عالم خان نے کہا کہ ادارہ ہمدرد ہمیشہ عالمی ادارۂ صحت (WHO) کے ساتھ مل کر پاکستان کے کسی نہ کسی شہر میں یومِ صحت کا انعقاد کرتا ہے۔ اس کے لیے ہم ہمدرد کے مشکور ہیں۔

مہمانِ خصوصی محترم مظہر نثار نے صحتِ عامہ کی اہمیت اُجاگر کرنے کے لیے ہمدرد کی کاوشوں کو سراہا اور اس بات پر زور دیا کہ ہمارے باقی اداروں کو بھی ایسی روش اپنانا چاہیے۔ ہماری بدقسمتی یہ بھی ہے کہ ہم تحقیق کے شعبے میں بہت پیچھے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں ڈاکٹر کبھی خود تو کبھی مریض کے اصرار پر غیر ضروری اینٹی بایوٹکس استعمال کراتے ہیں۔ ہمیں اس رجحان کو روکنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے عام آدمی میں آگہی پھیلانے کی ضرورت ہے۔

☆

سید معاذ علی ناصر، ملیر ہالٹ

بریرہ خالد، لاہور

سنبل محمود عالم انصاری، میر پور خاص

حمزہ طارق، لاہور

بے بی رمشا، کراچی

راؤ محمد یوسف کنور، سکندر آباد

عوین فہیم، کراچی

ایک بلی کی آپ بیتی

محمد سراج الدین

میں ایک بلی ہوں۔ میرا رنگ سفید ہے۔ میرا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہے۔ کبھی میں کسی دکان میں سو جاتی ہوں تو کبھی کسی بنچ کے نیچے مجھے نیند آ جاتی ہے۔ یا کبھی کسی گھر کے ایک کونے میں اپنی ڈیرا لگا لیتی ہوں۔ میں زیادہ تر گوشت کھاتی ہوں اور مجھے دودھ بھی پسند ہے، مگر مجھے یہ چیزیں آسانی سے نہیں ملتیں۔ کبھی کبھار تو مجھے چوری کرنی پڑتی ہے۔ مجھے پتا ہے کہ چوری کرنا بُری بات ہے، مگر کیا کروں! پیٹ کا دوزخ تو بھرنا ہوتا ہے، لہٰذا جب آسانی سے کوئی چیز نہ ملے تو میں کسی قسائی کی دکان سے یا پھر کسی گھر میں رکھا گوشت چرا لیتی ہوں اور کبھی سنہری موقع ملے تو کسی انسان کے حصے کا دودھ پی کر مزے لیتی ہوں۔

اپنے منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے میں چوزے، کبوتر، تیتر، بٹیر، توتے اور چڑیوں کا شکار کرتی رہتی ہوں، لیکن مجھے سب سے زیادہ مزہ چوہے کا شکار کرنے میں آتا ہے۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ جب میں کسی چوہے کو دیکھتی ہوں تو مجھے غصہ آ جاتا ہے اور جب تک اسے پکڑ نہ لوں اور کھا نہ جاؤں، مجھے چین ہی نہیں ملتا، لیکن آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں۔ خود مجھے سب سے زیادہ کتے سے ڈر لگتا ہے، حال آنکہ میں نے کبھی کتوں کو تنگ

نہیں کیا اور نہ کبھی انھیں چھیڑا، پھر بھی جانے کیوں وہ مجھے دیکھتے ہی میرے پیچھے بھاگتے ہیں اور بھونک بھونک کر میرا خون خشک کر دیتے ہیں اور میرے لیے دُم دبا کر بھاگنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ آخر مجھے کسی دیوار یا درخت پر چڑھ کر اپنی جان بچانا پڑتی ہے۔

یہ انسان بھی میرے بارے میں عجیب باتیں کرتے ہیں۔ ایک طرف کہتے ہیں کہ میں شیر کی خالہ ہوں۔ حال آنکہ میرا بھانجا اتنا بے مروت ہے کہ کبھی خود مجھے سلام کرنے نہیں آیا اور اگر میں اس کے قریب سے گزر جاؤں تو بھی اسے توفیق نہیں ہوتی کہ مجھے بھول کر ہی سلام کر لے اور میرا حال احوال پوچھ لے۔ دوسری طرف ان انسانوں کا کیا پوچھتے ہو، جو مجھے منحوس سمجھتے ہیں۔ اگر کسی سفر پہ جاتے ہوئے میں ان کے سامنے سے گزر جاؤں تو وہ برا شگون لیتے ہیں کہ اب انھیں سفر میں کسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مجھے ایسی سوچ پر غصہ بہت آتا ہے، مگر میں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ میری ان سے گزارش ہے کہ ان باتوں میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ مجھے غلط نہ سمجھا جائے۔ مجھ سے کسی کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

مجھے انسانوں کے بچوں سے زیادہ ڈر لگتا ہے۔ یہ مجھے بہت تنگ کرتے ہیں۔ میں ان کے ہاتھ لگ جاؤں تو بس میری شامت آ جاتی ہے۔ کبھی مجھ پر پتھر پھینک رہے ہیں تو کبھی ٹھنڈے پانی سے مجھے نہلا رہے ہیں اور کبھی تو کسی چھڑی سے میری پٹائی بھی کر دیتے ہیں۔ جب میری تکلیف بڑھ جاتی ہے تو میں انھیں کاٹ کھانے کو دوڑتی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ مجھے یہ انسان کبھی کبھار کھانے پینے کی چیزیں دے دیا کریں تو ان کی مہربانی ہوگی، پھر میں ان کے ہاں چوری کرنے سے توبہ کرلوں گی۔ اگر یہ میرا خیال رکھیں گے تو میں ہمیشہ ان کی وفادار رہوں گی۔ بے شک مجھے آزما کر دیکھ لیں۔

☆☆☆

ایک مقبول شخصیت

حمیرا سید

آپ شاید سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ نونہال ادب کی مقبول شخصیت سے میری کیا مراد ہے۔ مسعود احمد برکاتی طویل عرصے سے بچوں اور بڑوں کے ادب کے فروغ کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ انھوں نے چودہ برس کی عمر میں (۱۹۴۷ء سے) صحافت کا آغاز کیا اور اپنے دادا علامہ حکیم سید برکات احمد کے نام پر ''البرکات'' کے نام سے ایک قلمی ماہ نامہ نکالا۔ ۱۶- سال کی عمر سے مضمون نگاری شروع کر دی۔ آپ نے ۲۰ سے زائد کتابیں لکھیں، کئی اہم کتابوں کے انگریزی سے ترجمے کیے۔ لاتعداد کہانیاں اور مضامین لکھے ہیں۔ آپ ملکی اور غیر ملکی کانفرنسوں اور سیمینارز میں شرکت وصدارت اور مقالات بھی پیش کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ یونیسکو کے ماہ نامے کوریئر کے اردو ایڈیشن ''پیامی'' میں شریک مدیر رہے ہیں اور بہت سے ملکوں کے مختلف اخبارات ورسائل میں اپنی تحریروں و مضامین کے جوہر دکھا چکے ہیں۔

آج میں مسعود احمد برکاتی صاحب کی ذاتی زندگی اور ادب کے میدان میں ان کے کارناموں پر دانش وروں، ادیبوں، دوستوں اور کچھ عزیزوں کے تاثرات پیش کر رہی ہوں۔

آپ کے بڑے بھائی حکیم، ڈاکٹر محمود احمد برکاتی صاحب جو خود بھی بہت سی تحقیقی

کتابوں کے مصنف ہیں، کہتے ہیں: ''مسعود میاں میرے سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔ مجھے بے حد عزیز ہیں۔ انھوں نے مجھ سے آج تک اونچی آواز میں بات نہیں کی، ہمیشہ دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ میرا بہت احترام کرتے، میری صحت کی بہت فکر کرتے ہیں، خیریت معلوم کرتے رہتے ہیں۔ میں بھی ہمدرد نونہال کا مطالعہ ضرور کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ یہ اسی طرح سے علم و ادب کی خدمت کرتے رہیں۔''

ہم ایک دن برکاتی صاحب کے گھر پہنچے تو ان کے پوتے سرمد خالد نے دروازہ کھولا۔ السلام علیکم کہتے ہوئے بڑے اخلاق سے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا، جو بہت سادہ اور سلیقے سے آراستہ تھا۔ آپ کی بیگم زاہدہ مسعود جو ایک استاد ہیں، کبھی کبھی ہمدرد نونہال میں لکھتی بھی ہیں۔ گلابی رنگ کے سوٹ میں اُن کی مسکراہٹ بھی انھیں پُرکشش بنا رہی تھی۔ بیگم زاہدہ مسعود کہتی ہیں: ''چاہے ان کی طبیعت کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو، یہ ہمت کرکے دفتر چلے جاتے ہیں کہ کام ادھورا نہ رہ جائے۔ کھانے پینے کے بہت شوقین نہیں ہیں۔ ڈاکٹر کے مشورے پر گوشت کم کھاتے ہیں، جب کہ سبزی شوق سے کھاتے ہیں۔ ٹی وی بہت کم دیکھتے ہیں، اہتمام کے ساتھ کبھی بھی ٹی وی نہیں دیکھتے، البتہ خبریں اور ادبی پروگرام شوق سے دیکھتے ہیں۔ ہم میں کبھی کبھی بحث بھی ہو جاتی ہے، لیکن بہت جلدی اسی طرح بولنے لگتے ہیں، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ان کا ذہن ہر وقت سوچ و فکر میں مشغول رہتا ہے۔ میں اپنی حد تک ان کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ ان کی تحریروں سے متعلق میں سمجھتی ہوں کہ ان کا اسلوب بیان انتہائی سادہ اور سلیس ہے۔ انھیں بچوں کے ذہن کا خوب علم ہے کہ بچے کیا پسند کرتے ہیں، کیا نہیں۔''

خالد مسعود برکاتی (صاحبزادے): میری اور بہنوں کی تربیت میں پاپا کا بہت عمل دخل ہے۔ پاپا نے ہمیشہ ہماری تعلیم پر خاص توجہ دی۔ ہمیشہ کہتے تھے: ''خوب اچھی

[illegible] کتابوں کا مطالعہ کیا کرو۔ پاپا کی خاص توجہ سے میں انجینئر بنا ہوں۔ اب یہی مشورہ [illegible] ے بچوں، عزیر خالد، سرمد خالد اور بیٹی عائشہ خالد کو دیتے ہیں۔ پڑھائی کے معاملے [illegible] پاپا بہت سخت ہیں۔''

برکاتی صاحب کی تین صاحبزادیاں ہیں۔ بڑی بیٹی عفیفہ وسیم، دوسری بیٹی [illegible] مجاہد، تیسری بیٹی صالحہ شعیب ہیں۔

صالحہ شعیب (بیٹی): میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹی بیٹی ہوں۔ پاپا کے [illegible] قریب ہوں۔ پاپا کی تحریریں بچوں کے لیے تفریح اور معلومات کا ذریعہ ہیں اور بچے [illegible] ن کی کہانیاں بہت شوق سے مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ میں بھی اپنے بچوں کو ایسی کہانیاں پڑھواتی ہوں۔

عائشہ خالد (پوتی): ابا جان مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش پر میں [illegible] اکٹری پڑھ رہی ہوں۔ میرے ابا جان ہمدرد، غم گسار اور بہت پیار کرنے والے انسان [illegible] ں۔ ابا جان میرے آئیڈیل ہیں۔

شہید حکیم محمد سعید نے ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ''دوست بنانا آسان ہے، [illegible] وستی کا حق ادا کرنا آسان نہیں ہے۔ میرے ایک دوست اور میرے رفیق مسعود احمد برکاتی [illegible] یں۔ دوستی کو ۳۶ سال تو ہو گئے ہیں، خوب دوستی ہے۔ بڑی گاڑی چھنتی ہے۔ ہم دونوں [illegible] مل کر رات دن کام کیا۔ اب سچ یہ ہے کہ ''ہمدرد نونہال'' لاکھوں نونہال دوستوں اور [illegible] ے درمیان رابطے کا کام کرتا ہے۔''

محترمہ سعدیہ راشد نے اپنے ایک پیغام میں لکھا ہے: ''بچوں کے ہر دل عزیز

اور مقبول ماہ نامے ''ہمدرد نونہال'' کے مدیرِ اعلا جناب مسعود احمد برکاتی صاحب کو بچپن ہی سے علم و ادب کا ذوق رہا ہے۔ وہ اردو، فارسی، عربی اور طبی تعلیم کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کو انگریزی زبان اور ادب پر بھی خاصا عبور حاصل ہے، اس لیے مترجم کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ جناب برکاتی صاحب ایک نامور ادیب، مصنف، مضمون نگار، تبصرہ نگار، دیباچہ نگار ہیں۔ خاص طور پر بچوں کے ادب میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ برکاتی صاحب اسی طرح چمکتے دمکتے اور لکھتے رہیں، تا کہ ہر شعبۂ زندگی کے لوگ خاص طور پر نونہال مستفید ہوتے رہیں۔

مشتاق احمد یوسفی (ممتاز مزاح نگار): مسعود احمد برکاتی سے میری شناسائی برسوں سے ہے۔ مجھ سے، میرے خاندان سے ان کی ہمیشہ سے گہری وابستگی رہی جو آج بھی قائم و دائم ہے۔ برکاتی صاحب نے خوب لکھا۔ برکاتی صاحب بچوں کے ادب کے لیے وقف ہیں۔ ۶۰ سال تک پاکستان کے نونہالوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت پر انھوں نے ان تھک و بے لوث خدمت کی ہے، وہ قابلِ ستایش بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ پاکستانی نسلیں ان کی احسان مند ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اسلم (ماہرِ امراضِ قلب): مسعود احمد برکاتی کی حیثیت اردو ادب میں عموماً بچوں کے ادب خصوصاً ایک اہم مدیر، ادیب و ترجمان کی ہے۔ انھوں نے جس تسلسل سے بچوں کے ادب کی تخلیق، تشکیل و تہذیب میں حصہ لیا ہے، وہ نہایت گراں قدر اور وقیع کام ہے، جو بچوں کے ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھنے کو کافی ہے۔

میرزا ادیب: مسعود احمد برکاتی کو بچوں کے ادب میں ایک ایسے نامور ادیب

کا اعزاز حاصل ہے، جن سے بچے بہت محبت کرتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے دل چسپ کہانیاں لکھی ہیں، مضامین لکھے ہیں۔ صحت کے بارے میں مفید معلومات بھی بہم پہنچائی ہیں۔ برکاتی صاحب کا یہ کام ایک بڑا مستحسن کام ہے، مگر ان کا صرف یہی کام نہیں ہے، انھوں نے بچوں کے بڑے مقبول رسالے ''ہمدرد نونہال'' کے ذریعے سے اُن بچوں کے اندر کتاب خوانی کا شوق بھی اُبھارا ہے، جو ہمدرد نونہال کا مطالعہ کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے ایک طرف تو بچوں کو بڑی خوب صورت و رنگا رنگ تحریریں دی ہیں تو دوسری طرف نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ ہمت بڑھائی ہے، ان کو قیمتی مشورے دیے ہیں۔

جناب احفاظ الرحمٰن (مدیر میگزین روزنامہ ایکسپریس): محترم مسعود احمد برکاتی صاحب انتہائی شایستہ، منکسر المزاج اور وضع دار آدمی ہیں۔ وضع قطع، رکھ رکھاؤ کے آداب، اخلاق و گفتگو کے قرینے کوئی ان سے سیکھے۔ جہاں تک تحریر کا تعلق ہے، اس میدان میں بھی وہ ایک منفرد و نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ زبان و بیان، املا و انشا کے رموز پر ان کی رائے سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ علم و ادب کے سمندر کی گہرائیوں کے شناور ہیں۔ ان کی ذات ہمارے لیے باعثِ تقلید ہے اور ہمیں ان سے اکتسابِ علم کرتے رہنا چاہیے کہ ہمارے درمیان ان کا دم غنیمت ہے۔

مرزا ظفر بیگ (معاون مدیر روزنامہ ایکسپریس): جناب مسعود احمد برکاتی میرے وہ استاد ہیں، جنھوں نے صحیح معنوں میں میری شعوری تربیت کی۔ آپ نے مجھے حروف اور الفاظ بھی سکھائے اور ان کی آبرو سے بھی روشناس کرایا۔ اگر میں یہ کہوں کہ برکاتی صاحب نے مجھے واقعتاً قلم پکڑنا سکھایا تو بے جا نہ ہوگا۔ انسان کو جب قلم پکڑنا

آ جائے تبھی اس کا ادراک سفر شروع ہوتا ہے، جس کے بعد وہ انجان سے جاننے کی طرف بڑھتا ہے، ورنہ قلم تھامنے میں ہچکچاہٹ انسان کو عدم واقفیت میں ڈبوئے رکھتی ہے۔ برکاتی صاحب کی شخصیت کے دو پہلو بہت نمایاں ہیں، ایک ان کی آواز، دوسری ان کی عقابی اور دل کے اندر اُترتی آنکھیں۔ ان کی آواز میں بڑی شفقت، بڑا پیار اور غضب کا دھیما پن ہے۔ اول تو انھیں غصہ آتا ہی نہیں، اگر آتا ہے تو بھی ان کی آواز حد سے آگے نہیں بڑھتی، اس غصے میں بھی وہ کبھی سامنے والے پر خفا نہیں ہوتے، بلکہ خود سے ناراضی کا اظہار کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ہی کچھ نہ کچھ کہہ ڈالتے ہیں۔

غلام محی الدین (میگزین ایڈیٹر روزنامہ جنگ، کراچی): مسعود احمد برکاتی کی ادب صورت، آسان و سادہ زبان میں دل چسپ و سبق آموز کہانیاں پڑھتے رہے۔ مجھے فون پر جب بھی اُن سے بات ہوئی تو انھوں نے نہایت شفقت سے گفتگو فرمائی۔ اکثر ہمارے ٹیلے فون ان سے تحریر کی فرمایش کے لیے یا کسی مسئلے پر تبصرے کے حصول کے لیے ہوتے رہتے ہیں۔ مسعود احمد برکاتی ایسی شخصیت ہیں، جو وضع دار، شفقت، محبت اور رواجوں میں اپنی مثال آپ ہیں۔

امان اللہ نیر شوکت (لاہور): میں مسعود احمد برکاتی صاحب سے ابھی تک ملا تو نہیں ہوں، لیکن میں انھیں ایک طویل عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ وہ نہایت خوش اسلوبی سے خونِ جگر دے کر بچوں کے لیے ادب تخلیق کر رہے ہیں، ان کے شعور و فکر کی روشنی سے بے شمار ہونہار بچے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کا ہر لفظ بہت احتیاط اور سوچ سمجھ کر استعمال کرتے ہیں۔ لفظ کے انتخاب میں فکر و نظر سے کام لیتے ہیں۔ وہ بچوں کے

ذہن میں وطن سے محبت کا جذبہ بیدار رکھتے ہیں۔ وہ خود ایک اکیڈمی کا درجہ رکھتے ہیں۔

سید قاسم محمود نے ایک مضمون میں لکھا تھا: یہ جو بکھرے بکھرے سفید بالوں والا بوڑھا نونہال، آپ کے سامنے مسکراتی آنکھیں، مسکراتا چہرہ لیے بیٹھا ہے، اس کا سینہ برصغیر پاک و ہند کی مسلسل دو صدیوں کی علمی و ادبی میراث کا امانت دار اور اسلامی تہذیبی روایات و اقدار کا خزانہ ہے۔ آؤ ہم سب مل کر اس کی صحتِ کاملہ، تن درستی، استحکامِ قلب، سلامتیِ طبع اور درازیِ عمر کے لیے دعا کریں۔

حمیرا اطہر (انچارج بچوں کا صفحہ روزنامہ ایکسپریس): مسعود احمد برکاتی صاحب سے میرا غائبانہ تعلق اس وقت بنا، جب میں پرائمری میں پڑھتی تھی۔ اس زمانے میں میرے والد ڈاکٹر اطہر نادر، میرے لیے جو چار پانچ رسالے خریدا کرتے تھے، ان میں ایک ''ہمدرد نونہال'' بھی ہوتا تھا۔ برکاتی صاحب سے ملاقاتیں کم کم ہی ہوئیں، تاہم اُس عمر میں بھی کام سے ان کی لگن و محنت دیکھ کر رشک آتا ہے۔ اب جو میں خود گزشتہ تقریباً چھے برس سے ایک روزنامے سے وابستہ ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کی تحریروں کا انتخاب اور ان کی زبان و بیان کی درستی کتنا کٹھن اور صبر آزما کام ہوتا ہے۔ پھر بھی بچوں کے طعنے سننا کہ ''آپ لوگ اپنے جاننے والوں اور رشتے داروں کی تحریروں کو ہی اہمیت دیتے ہیں۔'' مجھے یقین ہے کہ برکاتی صاحب کو بھی دل جلے لکھاریوں کی جانب سے اس قسم کے طعنے ملتے ہوں گے، لیکن آفرین ہے ان پر کہ مسکرا مسکرا کے اپنا کام کیے جاتے ہیں۔ میں نے بھی یہ ہنر لاشعوری طور پر شاید ان ہی سے سیکھا ہے۔

☆☆☆

معلوماتِ پاکستان

مرتبہ: سعید عبدالخالق بھٹہ

۱۔ چودھری رحمت علی نے لندن میں اپنی جماعت ''پاکستان نیشنل موومنٹ'' ۱۹۳۲ء میں بنائی تھی۔

۲۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے مزار کا نقشہ ماہرِ فن یحییٰ مرچنٹ کی تخلیق ہے۔

۳۔ دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ پر پہلی بار پاکستانی پرچم ۱۷ مئی ۲۰۰۰ء کو لہرایا گیا۔

۴۔ پاکستان کے خلائی تحقیقی ادارے ''سپارکو'' کی بنیاد ۱۹۶۱ء میں رکھی گئی تھی۔

۵۔ پاکستان کا قومی پرندہ چکور ہے۔

۶۔ ''حیاتِ محمد علی جناح'' رئیس احمد جعفری کی تصنیف ہے۔

۷۔ اردو زبان کے مشہور شاعر فیض احمد فیض کا انتقال ۲۲ نومبر ۱۹۸۴ء کو ہوا۔

۸۔ [illegible] ظہیر عباس ۲۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

۹۔ ریڈیو پاکستان کا مونوگرام مشہور مصور جناب عبدالرحمٰن چغتائی نے بنایا تھا۔

۱۰۔ تمغۂ پاکستان، ہلالِ امتیاز، ستارۂ امتیاز اور صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی حاصل کرنے والے [illegible] سائنس داں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کا انتقال ۱۴-اپریل ۱۹۹۴ء کو ہوا۔

۱۱۔ بولان میڈیکل کالج کوئٹہ میں واقع ہے۔

۱۲۔ مشہور نعت گو شاعر مظفر وارثی مرحوم نے ''گئے دنوں کا سراغ'' کے عنوان سے اپنی خودنوشت سوانح عمری تحریر کی تھی۔

۱۳۔ معروف سندھی شاعر، نقاد اور افسانہ نگار شیخ ایاز کا اصل نام شیخ مبارک علی تھا۔

۱۴۔ مشہور ادیب، مزاح نگار احمد شاہ بخاری پطرس کا انتقال ۵ دسمبر ۱۹۵۸ء کو ہوا۔

۱۵۔ شہیدِ پاکستان حکیم محمد سعید کی صاحب زادی محترمہ سعدیہ راشد ہمدرد فاؤنڈیشن کی صدر اکتوبر ۱۹۹۸ء میں بنیں۔

۱۶۔ حکومتِ پاکستان نے ۱۹۵۶ء میں مسقط اور عمان کے سلطان سے گوادر کی بندرگاہ خریدی تھی۔

۱۷۔ صدارتی الیکشن میں مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کا انتخابی نشان لالٹین تھا۔

۱۸۔ ۱۷ جون ۱۹۸۵ء کو صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے ہمدرد یونی ورسٹی کراچی کا سنگِ بنیاد رکھا۔

۱۹۔ ۱۴-اکتوبر ۱۹۷۲ء کو پاکستان کے مشہور انگریزی اخبار ''ڈان'' نے اپنی سلور جوبلی منائی تھی۔

۲۰۔ پاکستان میں پہلا آسٹروٹرف، ہاکی کلب آف پاکستان کراچی میں ۴ دسمبر ۱۹۷۹ء میں بچھایا گیا۔

۲۱۔ مشہور بزرگ صوفی شاعر حضرت خواجہ غلام فرید کا مزار پاکستان کے شہر مٹھن کوٹ میں ہے۔

۲۲۔ مغل بادشاہ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں (مہر النسا) کا مقبرہ لاہور میں ہے۔

۲۳۔ مشرقی بنگال کا نام بدل کر ''مشرقی پاکستان'' ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو رکھا گیا۔

۲۴۔ ۱۵ جولائی ۱۹۶۱ء کو حکومتِ پاکستان نے چنبیلی (گلِ یاسمین) کو قومی پھول قرار دیا۔

۲۵۔ سکھوں کا مشہور گوردوارہ ''پنجہ صاحب'' پاکستان کے شہر حسن ابدال میں واقع ہے۔

۲۶۔ مایہ ناز کرکٹر جاوید میاں داد ۱۹۸۰ء میں پاکستان کرکٹ ٹیم کے کپتان بنائے گئے تھے۔

۲۷۔ فیصل مسجد کا سنگِ بنیاد سعودی حکمراں شاہ خالد بن عبدالعزیز نے رکھا تھا۔ اس پر آرٹسٹ گل جی آغا نے بہت عمدہ آرائشی کام کیا۔

۲۸۔ صدرِ مملکت جنرل محمد ضیاء الحق نے کہوٹہ ایٹمی پلانٹ کا نام بدل کر عبدالقدیر خاں ریسرچ لیبارٹریز رکھنے کی منظوری یکم جنوری ۱۹۸۴ء کو دی تھی۔

۲۹۔ ۱۱-اگست ۱۹۵۵ء سے ۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء تک پاکستان کے وزیرِ اعظم چودھری محمد علی تھے۔

۳۰۔ مشہور اخبار ''نوائے وقت'' حمید نظامی مرحوم نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو جاری کیا تھا۔

۳۱۔ ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی خودنوشت سوانح عمری کا اُردو ترجمہ ہے۔

☆

بلاعنوان کہانی کے انعامات

اپریل ۲۰۱۱ء میں جناب شکیل صدیقی کی بلاعنوان کہانی شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی کے بہت اچھے اچھے عنوانات موصول ہوئے۔ کمیٹی نے بہت غور کرنے کے بعد صرف ایک عنوان **"چھوٹے میاں سبحان اللہ"** کو بہترین قرار دیا ہے۔ یہ عنوان ہمیں مختلف جگہوں سے پانچ نونہالوں نے ارسال کیا ہے۔ ان نونہالوں کو انعام کے طور پر ایک کتاب روانہ کی جائے گی۔

۱۔ فاطمہ علی، بلال ٹاؤن، کراچی

۲۔ حمزہ احمد، نارتھ ناظم آباد، کراچی

۳۔ حفصہ نادر، مسلم آباد، میرپور خاص

۴۔ محمد فہد خان چغتائی، ڈیرہ غازی خان

۵۔ غزل عائشہ کلیم، قصابان چوک، بنوں سٹی

چند اور اچھے اچھے عنوانات یہ ہیں:

انوکھی شرارت۔ چوروں کو پڑ گئے مور۔ تنگی کا ناچ۔ ننھا بہادر۔ ننھا ہیرو۔ ننھا ماشاءاللہ۔ تین ڈاکو۔ ایک لڑکا۔ ننھا جاسوس۔ اصلی ہیرو۔ ننھا سپاہی۔ ذہین لڑکا۔

ان نونہالوں نے بھی ہمیں اچھے اچھے عنوانات بھیجے

☆ **کراچی:** مزمل محمد عابد، ثمن ناز، حفصہ اعجاز الرحمٰن، سید محمد احمد، نورین محمد سلیم، خدیجہ زاہد، زینب رضا، [illegible] حسن، ربیعہ اقبال، محمد حمزہ اشرفی، سیدہ ہدیٰ سرور، حافظ مخیلہ وسیم، عائشہ محمد حنیف، [illegible] راشد صدیقی، عائشہ وحید، ورشا اعجاز، زوبیہ رضی، مریم سرور، سارا اسحاق، سدرہ ہلال، تسنیم، واجد گیلانی، لالہ تنویر، طہٰ محمود، سندس آسیہ، علیزہ سہیل، سمیرا عبدالخالق، محمد اسماعیل، محمد صہیب علی، محمد احمد معظم، سیدہ نمیرہ مسعود، اعجاز الحق نمرہ ثنا، رضوان احمد، آبلہ نور محمد فیصل، عفیفہ عثمانی، حفظہ مقصود رضا، عباس علی مونی، محمد حیات اعوان، محمد سعد افراہیم، عائشہ الیاس، رخسانہ جنید، مریم سلطان

ڈار، سیدہ جویریہ جاوید، سید محمد عباس، مدحت عزیز، فاطمہ علی، انشراح یاسر انصاری، سید شہظل علی اظہر، محمد انس خان غوری، فارعہ محمد، محمد شفیع، سید باذل علی اظہر، حاسن یاسر انصاری، محمد کاشان اسلم، سیدہ عفیفہ جاوید، شاہ بشریٰ عالم، سید عفان علی جاوید، سیدہ مریم محبوب، رعد الدین، حسن شفیق، انشراح ریحان عقیل خاں، سمعیہ پرویز، محمد جعفر خالد، محمد عاشر صابر چوہان، فاخرہ ساجد، ساحرہ محمد رمضان، کلثوم سحر محی الدین، علی تنویر پھول، شفیق تنویر پھول، ثنا تنویر پھول، سہیل احمد بابوزئی، وجیہہ قیصر، مریم اویس، اریبہ خان، سید زین الحسن، ارج فاطمہ، شفیق انجم غلام سبحانی، محمد اسد اللہ ناصر، آصف احمد، مدیحہ فرقان، دعا فاطمہ امیر، نایاب شمس الہدیٰ، حرا اقبال نوی والا، سید بلال حسین ذاکر، عروسہ اویس، شمع ناز محمد اسلم، وردا، عمارہ جمیل، فاطمہ بنت اسد، فائزہ مفتی، کائنات زاہد حسین، سیدہ حفصہ شمشاد، کومل محمد اقبال، سمانہ تقوی، نعیم رحمٰن خانزادہ، ثنا اسد، اسما راشد، فہیم اقبال احمد شیخ، ردا عابد، اقصیٰ کبیر احمد، ردا اسلم خانزادہ، ثنا بیگ، شازیہ انصاری، عافیہ سلمان، صفورا نثار، حبیبہ حفیظ، سید محمد فیضان، سید محمد حذیفہ، ظل عائشہ، حمزہ احمد، آہانہ بنت زاہد، سیدہ رباب حسین رضوی، مریم رحمٰن، سلمہ محمد صلاح الدین، سارہ تابش، واجد علی، محمد حارث موتی والا، سیدہ سمانیہ حق، سید واصف الحق، سیدہ سدرہ حق، بنت محمد طارق عبدالباری، حرا بنت محمد صدیق، عروج اسلم، سیدہ ثوبیہ ناز ☆ **حیدرآباد:** محمد شعیب بنگش، محمد اسامہ انصاری، شہنور سخاوت، محمد اسحاق، بشیر احمد کھتری، عائشہ ایمن احتشام، مرزا اسفار بیگ، محمد عدیل رشید، عبدالرحمٰن خان، اقصیٰ اویس، طہٰ یاسین، سعدیہ عبدالواحد انصاری، محمد نواز شریف، راجپوت، حرا بنت محمد صدیق، عروج اسلم، سیدہ ثوبیہ ناز ☆ **مکلی ٹھٹھہ:** ام کلثوم، وجیہ جاوید، اقصیٰ احمد، تیمور جاوید، عائشہ بی بی، ضحیٰ فاطمہ، سوہل قریشی ☆ **میرپور خاص:** نازش محمد اکرم، ربیعہ ناز ذوالفقار علی، حفصہ نادر، برکھا گوسوامی، شانزہ خان، ہمایوں عبدالستار قائم خانی، سارہ اسماعیل، وقار احمد، ماہ وش یوسفائی، آشیش کمار، کرن شوکت، مظفر احمد شیخ کیلانی ☆ **ٹنڈو آدم:** فیروز مری، ساجدہ رمضان ☆ **سانگھڑ:** عروج ذوالفقار علی، منیب احمد رندھاوا، محمد افضل رندھاوا، سویرا خالد، میمونہ ساجد، اقصیٰ ثمرہ جاوید انصاری ☆ **شہداد پور:** زین العابدین ☆ **جھورو:** رانا مرتضیٰ حیدر راجپوت، رانا مبین حیدر راجپوت، رانا

ذوالفقار حیدر راجپوت، رانا ذوالقرنین حیدر راجپوت ☆ **نوشہرو فیروز:** شایان آصف خانزادہ ☆ **سکرنڈ:** عبداللہ محمد انور مغل ☆ **سکھر:** دلشاد انصاری، کرن عبدالستار، سدرۃ المنتہیٰ بنت تسنیم احمد قادری، منیب احمد انصاری، حوریہ معاذ انصاری، عائشہ محمد خالد قریشی ☆ **گھوٹکی:** خوش بخت ☆ **میر پور ماتھیلو:** محمد اویس گذانی ☆ **لسبیلہ (بلوچستان):** ایم شفیع چاہت بلوچ ☆ **اوتھل (لسبیلہ):** صلاح الدین ☆ **تربت مکران:** ہلال موسیٰ بلوچ ☆ **جعفر آباد (بلوچستان):** وحید مراد بھنڈ، عمران گل کنبار ☆ **کوئٹہ:** آسیہ ظاہر ☆ **لودھراں:** محمد ابوبکر وقاص، حارث محمود ☆ **ملتان:** عمر دراز نوناری، محمد زبیر ارشد، ربیعہ نعیم ☆ **بہاول نگر:** فرحان اشرف، عروج علی ☆ **فیصل آباد:** ولید اکرم، ماہم انبساط اظہر ☆ **سرگودھا:** محمد شعیب مصطفیٰ، ندا جمال، امیر بخت منیر ☆ **لاہور:** فاطمہ شاہد، امتیاز علی ناز، عائشہ مجید، احسن عرفان، نیہا حماد مغازی خان، فاطمہ سرفراز ☆ **جہلم:** محمد شعیب حسن سیالوی، راجہ ثاقب محمود جنجوعہ، اقراء ساہی ☆ **راولپنڈی:** عبدالرحمٰن، عائشہ مناہل، محمد فصیح احمد، محمد احمد، راضیہ سید ☆ **بھکر:** سدرہ وحید، ریحان فرحان ☆ **جھنگ:** محمد عمر حسن ☆ **ڈیرہ غازی خان:** محمد شہباز احمد سرکانی، نور محمد سرکانی، محمد فہد خان چغتائی، عبداللہ سلمان، احمد حسین چشتی، محمد اکبر جاوید سرکانی ☆ **چکوال:** عطیہ نعیم، ہمایوں افضل، لبنیٰ منظور ☆ **رحیم یار خان:** مدثر رشید ☆ **بہاول پور:** نائلہ ملک ☆ **چیچہ وطنی:** عزیز عابد ☆ **کبیر والا:** محمد قیصر نواز بھٹی ☆ **ٹوبہ ٹیک سنگھ:** عائشہ اسلم ☆ **کوٹ رادھا کشن:** عبدالقیوم نظر ☆ **شیخوپورہ:** فضیلہ ذکاء بھٹی ☆ **وہاڑی:** شاردل، حماد، ریاں: رفعت بتول ☆ **گوجرانوالہ:** نوال فاطمہ ☆ **اسلام آباد:** نور العین ☆ **بنوں سٹی:** نوال عائشہ کلیم، اظہار الحق اظہار ☆ **ڈیرہ اسماعیل خان:** بلوشہ سیال ☆ **مردان:** حارث یونس ☆ **ٹانک:** احسن محمود اعوان ☆ **ایبٹ آباد:** باسل اللہ سید ☆ **ہزارہ:** راؤ عرباض حسن ☆ **اٹک:** ملک محمد سفیر ☆ **پشاور:** حافظ محمد اسامہ خٹک، اختر منیر ☆ **کوٹلی آزاد کشمیر:** محمد جواد چغتائی، حافظ محمد شہزاد سلطانی ☆ **اوتھل:** محمد سبطین عاشر بھٹہ ☆ **خانیوال:** محمد ذیشان بابر ☆ **حویلیاں:** حامد عبدالباقی ☆ **نوشہرہ:** لیلیٰ جلیل الرحمٰن۔

☆☆☆

نونہال ادیب

لکھنے والے نونہال

فریحہ شہزاد، کراچی
عمران گل کنبار، ڈیرہ اللہ یار
تحریم خان، نارتھ کراچی
محمد طیب صالح، حیدر آباد
عروبہ شریف، کراچی
ایم ذیشان شیرازی دگھی، قادر پور راں
اسامہ احمد، کراچی
ارم نسیم خان، کراچی
ایلا محمود عالم انصاری، میر پور خاص
سارہ قاضی، واہ کینٹ
عروج قیوم، کراچی

حمدِ باری تعالیٰ

مرسلہ: فریحہ شہزاد، کراچی

میرے اللہ پیارے اللہ
سوہنے اور من موہنے اللہ
پھولوں میں تُو، کلیوں میں تُو
پھیلے تیرے جلوے ہر سُو
کھیتوں اور کھلیانوں میں تُو
ہے چٹیل میدانوں میں تُو
زمین اور آسمانوں میں تُو
ہے دونوں جہانوں میں تُو
روشن روشن تاروں میں تُو
بے شک سبزہ زاروں میں تُو
میرے اللہ پیارے اللہ
پھیلے تیرے جلوے ہر سُو

نعتِ رسول ﷺ

مرسلہ: عمران گل کنبار، ڈیرہ اللہ یار

ہم پاک نبیؐ کی اُمت ہیں
وہ اُلفت کرنے والے ہیں
ہم ننھی مُنّی جانوں پہ
وہ شفقت کرنے والے ہیں
ہم سادہ فطرت والوں پہ
وہ رحمت کرنے والے ہیں
وہ سیدھی راہ دکھاتے ہیں
ہر اچھی بات بتاتے ہیں
ہم اُن سے محبت کرتے ہیں
ہم اُن کی اطاعت کرتے ہیں
ہم پہ وہ خدا کی رحمت ہیں
اور اس کی خاص عنایت ہیں

نفرت کا پودا

تحریم خان، ناظم آباد، کراچی

آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک صحابی حضرت ابو خالدؓ حاضر ہوئے۔ انھوں نے حضورؐ سے درخواست کی کہ وہ انھیں کوئی نصیحت فرمائیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم سے خوش رہیں گے۔ وہ شخص جو دوسروں کے لیے بُرا سوچتا ہے، بُرائی خود اس کے سامنے آتی ہے۔ جو کنواں اس نے دوسروں کے لیے کھودا ہوتا ہے، اس میں وہ خود گرتا ہے۔

حضرت ابو خالدؓ کو یہ نصیحت اتنی پسند آئی کہ وہ ہر ایک کو سمجھاتے تھے کہ بُرائی کرو گے تو بُرا ہوگا، نیکی کرو گے تو اچھا ہوگا۔

ایک بدنیت یہودی عورت جو دوسروں کے لیے ہر وقت بُرا سوچتی رہتی تھی، اسے یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اسے ایسا لگا، جیسے حضرت ابو خالدؓ خاص طور پر اسی سے یہ بات کہہ رہے ہیں۔ ایک روز اس نے تشتری میں زہریلی مٹھائی رکھی اور ایک شخص بن گوریان کے ذریعے سے حضرت ابو خالدؓ کو بھجوادی۔ وہ اس وقت مدینے سے باہر جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے۔ انھوں نے مٹھائی لے لی اور بن گوریان کا شکریہ ادا کیا، پھر اس مٹھائی کو سفر کے سامان میں باندھ لیا۔

سفر کے دوران رات ہوگئی تو انھوں نے ایک درخت کے نیچے قیام کیا۔ اسی دوران دو جوان لڑکے وہاں آگئے۔ وہ مدینہ جا رہے تھے۔ ان کے درمیان علیک سلیک ہوئی۔ جب حضرت ابو خالدؓ کو معلوم ہوا کہ وہ دونوں لڑکے بھوکے ہیں تو انھوں نے اپنے سامان سے مٹھائی نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔ ان لڑکوں نے مٹھائی کھائی اور تھوڑی دیر بعد مر گئے۔ جب یہ خبر مدینے پہنچی تو حضورؐ کے حکم پر حضرت ابو خالدؓ کو گرفتار کر لیا گیا۔

انھوں نے وضاحت کی کہ مٹھائی انھیں ایک شخص بن گوریان نے لا کر دی تھی۔ جب اسے بلایا گیا تو اس نے بتایا کہ مٹھائی اسے ایک یہودی عورت نے دی تھی۔ اس عورت کو بلایا گیا وہ ان لڑکوں کی لاشیں دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سب حیران رہ گئے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ اس نے حضرت ابو خالدؓ کے ساتھ جو بُرائی کی تھی، وہ خود اس کے سامنے آگئی۔ وہ عورت ان کی نصیحتوں سے تنگ آکر انھیں ہلاک کرنا چاہتی تھی، لیکن خود اس کے ساتھ بُرا ہو گیا۔

''کیا مطلب؟'' کسی نے پوچھا۔

عورت روتے ہوئے بولی: ''یہ دونوں لڑکے جنھوں نے زہریلی مٹھائی کھائی ہے، میرے بیٹے ہیں۔ نفرت کا وہ پودا جو میں نے اپنے دل میں اُگایا تھا، اس نے خود مجھے ہلاک کر دیا۔'' اس کے بعد وہ پھر رونے لگی۔

سونے کی بطخ

محمد طیب صالح، حیدرآباد

پولینڈ میں ایک موچی لڑکا رہتا تھا۔ اس کا نام یاسکو تھا۔ وہ ایک بہادر اور جستجو کرنے والا نوجوان تھا، اس لیے اسے مہم جوئی بھی پسند تھی۔ اس کی جیب ہر وقت خالی رہتی تھی۔ وہ سوچتا رہتا کہ کس طرح اپنی مالی حالت درست کرے۔

دارالحکومت وارسا میں ایک پرانا قلعہ تھا، جس کے متعلق قصے مشہور تھے کہ اس کے نیچے سرنگیں ہیں۔ وہاں ایک چھوٹی سی نہر ہے۔ اس میں ایک سونے کی بطخ تیرتی رہتی ہے۔ یہ بطخ انتہائی لالچی ہے۔ وہ سرنگ میں زندگی گزارتی ہے، تاکہ اپنے خزانے کی حفاظت کرے۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ بطخ اپنا خزانہ اس بہادر آدمی کو دے گی، جو سرنگ میں جائے اور نہر تلاش کرے۔

ایک مرتبہ یاسکو نے سوچا کہ اپنی قسمت آزمائے، بطخ کو ڈھونڈے اور آسان طریقے سے مال دار ہو جائے۔ اس نے اچھا سا لباس پہنا اور قلعے کا رخ کیا۔ وہ کافی دیر تک ڈنڈیوں اور تاریک سرنگوں میں گھومتا رہا۔ اپنے ہاتھوں سے دیواریں ٹٹولتا ہوا آخر سیڑھیوں کے راستے سے نیچے پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو ایک بڑے اور روشن غار میں پایا۔ اس غار میں روشنی چھت کی باریک سوراخوں سے نکل رہی تھی۔ اس روشنی میں نہر کے پانی میں لہریں اُٹھتی دکھائی دے رہی تھیں۔ یاسکو پانی کے پاس رک گیا اور سوچنے لگا کہ لوگ کہتے ہیں کہ سرنگ کے نیچے نہر ہے، جس میں سونے کی بطخ رہتی ہے، میں اسے کہاں تلاش کروں اور خزانہ کیسے حاصل کروں؟

وہ سوچ ہی رہا تھا کہ پانی کے نیچے سے ایک سونے کے پروں والی بطخ نمودار ہوئی۔ غار مزید روشن ہوگیا۔ بطخ تیر کر کنارے تک آئی اور انسانی آواز میں کہنے لگی: ''تم ایک بہادر نوجوان معلوم ہوتے ہو، کیوں کہ تم یہاں آنے سے ڈرے نہیں۔ میں تمھیں اس کا انعام دوں گی، لیکن میرا خزانہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تمھیں صرف بہادر ہی نہیں بلکہ سنگ دل بھی ہونا چاہیے، کیوں کہ رحم دل آدمی بہت جلد اپنی دولت گنوا دیتا ہے، لہٰذا تمھارا ایک امتحان ہوگا۔ تم سو رپے لے لو اور ایک ہی دن میں اپنے آپ پر خرچ کر ڈالو۔ اگر کسی پر ایک رپیہ بھی خرچ کیا تو تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔''

یاسکو خاموشی اور توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔ پھر سو رپے لے کر وہ گھر لوٹ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رپے کیسے خرچ کرے؟ پھر دل میں کہنے لگا کہ میں اچھے کپڑے پہنوں گا، خوب کھاؤں گا۔ میں جلد ہی یہ رپے ختم کر دوں گا اور کل بطخ سے خزانہ حاصل کر لوں گا۔

یہ سوچ کر وہ ایک دکان پر گیا اور عمدہ کپڑے خریدے، پھر ایک شان دار ہوٹل کا رُخ کیا اور شہد کے ساتھ لذیذ کھانا طلب کیا۔ اسے سخت حیرت ہوئی، جب ایک رپے کا بل بنا۔ شام ہوگئی۔ وہ سوچنے لگا، باقی رپوں کا کیا کروں؟ وہ کافی دیر سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہا، پھر میدان کی طرف گیا، جہاں خیمہ لگا ہوا تھا۔ وہاں مداری اور بازی گر اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ وہ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اس نے بہت رپے لٹائے اور اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

وہ خیمے سے نکلا تو سوچنے لگا کہ اب بھی دس رپے باقی ہیں، انھیں کہاں خرچ کروں؟ وہ سوچوں میں گم کھڑا تھا کہ اچانک سفید بالوں والا ایک کبڑا بوڑھا اس کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''اے نوجوان! مجھ بوڑھے پر رحم کرو اور میری مدد کرو۔'' یاسکو کا دل بہت حساس تھا۔ کسی کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچتی تو وہ بے چین ہو جاتا تھا۔ اس نے بوڑھے کے ہاتھ میں ایک رپیہ تھما دیا۔

اچانک اس کے اردگرد روشنی پھیل گئی اور اس نے پیچھے سے بطخ کی آواز سنی۔ یہ آواز شیریں نہیں بلکہ تیز اور غصے والی تھی۔ بطخ کہہ رہی تھی: ''تم نے میری بات پر عمل نہیں کیا۔ ایک بے بس آدمی پر مہربانی کی۔ تمھارا دل ضرورت سے زیادہ حساس ہے اور تمھیں میرا خزانہ نہیں مل سکتا۔ اب سرنگ میں آنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ وہاں موت تمھاری منتظر ہوگی۔''

یاسکو نے اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن اسے کوئی نظر نہ آیا۔ بوڑھا بھی غائب تھا۔ شاید وہ اس وقت چلا گیا، جب یاسکو دھیان سے بطخ کی بات سن رہا تھا۔ اس نے شانے اُچکائے اور کہنے لگا: ''مجھے ایسی دولت نہیں چاہیے، جس سے دوسروں کی مدد نہ کرسکوں۔'' پھر وہ بڑی سڑک پر چلنے لگا اور سیٹی بجاتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ اچھے کپڑے جو بطخ کے رپوں سے خریدے تھے، صندوق میں چھپا کر رکھ دیے۔ اگلی صبح اپنے پرانے کپڑے پہنے اور پرانی طرزِ زندگی پر آ گیا، بہر حال وہ ایک اچھا اور کام سے دل چسپی رکھنے والا نوجوان تھا۔

کچھ عرصے بعد وہ اپنے کام میں ماہر ہوگیا اور اپنی دکان کھول لی۔ اسے بطخ کے خزانے سے محرومی کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ جب وہ ہتھوڑا چلاتا تو کہتا: ''میرے نزدیک لوگوں کا احترام سونے سے زیادہ اہم ہے۔ وہ ایک رپیہ جو میں اپنی محنت سے کماتا ہوں، سرنگ میں دفن خزانے سے زیادہ پیارا ہے۔''

ہمارا چاند

عروبہ شریف، کراچی

نظام شمسی میں زمین کا چاند جسے قمر بھی کہتے ہیں، بہت اہمیت کا حامل ہے۔ زمین، چاند کے بغیر ادھوری ہے۔ انسان چاند تک سفر طے کر کے اس پر چہل قدمی کر چکا ہے۔ امریکی خلائی جہاز ''اپالو گیارہ'' کو ۱۶- جولائی ۱۹۶۹ء کو خلا میں چھوڑا گیا تھا۔ نیل آرمسٹرانگ، مائیکل کولنز اور رایڈرن چاند پر اُترنے والے سب سے پہلے خلا باز تھے۔ یہ چاند گاڑی ۲۰ جولائی ۱۹۶۹ء کو چاند کی سطح پر اتری تھی۔ آرمسٹرانگ اور ایڈرن نے چاند کی سطح پر اتر کر امریکی پرچم اور دیگر سائنسی آلات نصب کیے۔ انھوں نے چاند کی سطح پر ۲۱ گھنٹے اور ۳۷ منٹ گزارے۔ زمین کا صرف ایک ہی چاند ہے۔ دوسرے سیاروں کے چاندوں کے مقابلے میں پانچواں بڑا چاند ہے۔ اس کا قطر تقریباً ۳۴۷۵ کلو میٹر ہے۔ چاند زمین سے تقریباً ۳۸۴،۴۰۰ کلو میٹر کے فاصلے پر گردش کر رہا ہے۔ اس کی اوسط رفتار ۳۷۰۰ کلو میٹر فی گھنٹہ ہے۔ یہ زمین کے گرد بیضوی مدار میں ۲۷ دن ۷ گھنٹے اور ۴۳ منٹ میں ایک چکر مکمل کرتا ہے۔

صفائی

مرسلہ: ایم ذیشان شیرازی دکھی، قادر پوراں

اچھے اچھے پیارے بچو!
میرے وطن کے سارے بچو!
اچھی بات بتاؤں گا میں
کچھ نہ کچھ سمجھاؤں گا میں
سن لو میری بات عزیز
ہے صفائی اچھی چیز
صفائی نصف ایمان ہے
صفائی دل و جان ہے
گندے بچے ہوں بیمار
ہوجائے گا انھیں بخار
صفائی کا تم رتبہ جانو
کہنا دکھی کا تم مانو

مکار سوداگر

اُسامہ احمد، کراچی

کسی ملک میں ایک نیک دل بادشاہ کی حکومت تھی۔ بادشاہ روزانہ رات کو بھیس بدل کر شہر میں گشت کیا کرتا تھا اور جب وہ کسی کو مصیبت میں گرفتار دیکھتا یا کسی پر ظلم ہوتے دیکھتا تو وہ دوسرے دن اسے دربار میں بلا کر اس کے ساتھ انصاف کیا کرتا تھا۔

بادشاہ کو جب کسی تاجر کی اپنے ملک میں آمد کا پتا چلتا تو وہ بھیس بدل کر اُس سوداگر سے ملتا، اسے پرکھتا کہ یہ سوداگر سچا اور ایمان دار ہے یا بے ایمان، پھر اسے اچھی طرح پرکھ کر اپنے شہر میں داخل ہونے دیتا۔ اچھے تاجر کو عزت و احترام دیتا اور بُرے تاجر کو بے عزت کر کے ملک بدر کر دیتا تھا۔

ایک دفعہ بادشاہ کو پتا چلا کہ ایک سوداگر کچھ سامانِ تجارت لے کر شہر کی طرف آرہا ہے۔ بادشاہ نے ایک بوڑھے آدمی کا بھیس بدلا اور سوداگر سے ملنے کے لیے چل پڑا۔ وہ سوداگر بڑا لالچی اور بے ایمان تھا۔ پیسے کی خاطر دھوکے بازی کو جائز سمجھتا تھا۔ سوداگر کے ساتھ بہت سے ملازم بھی تھے۔ وہ سفر کرتا ہوا شہر سے پچیس کوس دور جنگل میں پہنچا تو رات ہوگئی۔ اس نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ اسی جگہ خیمے لگا دو۔ رات آرام سے بسر کرو۔ ہم صبح کے وقت شہر میں داخل ہوں گے۔

سوداگر اپنے خیمے میں لیٹا شہر پہنچ کر سامان فروخت کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا کہ اس کے خاص ملازم نے آکر اطلاع دی: ''ایک بوڑھا آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

سوداگر اٹھا اور باہر آکر دیکھا تو ایک ضعیف آدمی میلے کچیلے کپڑے پہنے کھڑا ہے۔ بوڑھے نے سلام کر کے کہا: ''میں نے سنا ہے کہ آپ بہت بڑے تاجر ہیں۔ کیا آپ مجھ سے کچھ خریدیں گے؟''

''کیا بیچنا چاہتے ہو؟'' سوداگر نے دل چسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

بوڑھے نے دھیمے لہجے میں کہا:

"میرے پاس ایک قیمتی ہیرا ہے۔ اگر آپ خیمے میں لے چلیں تو میں آپ کو دکھاتا ہوں۔"

سوداگر بوڑھے کو لے کر خیمے میں آ گیا۔ بوڑھے نے اپنی جیب سے ہیرا نکال کر ہتھیلی پر رکھ لیا۔ ہیرے کی چمک دمک دیکھ کر سوداگر کی آنکھیں چندھیا گئیں، لیکن اس نے مکاری سے کام لیتے ہوئے کہا: "مجھے اسے پرکھ تو لینے دو۔"

بوڑھے نے وہ ہیرا سوداگر کے ہاتھ میں دے دیا۔ ہیرے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد سوداگر نے کہا: "یہ تو نقلی ہیرا ہے۔"

سنتے ہی بوڑھے نے جھپٹ کر وہ ہیرا سوداگر کے ہاتھ سے چھین لیا اور کہنے لگا: "تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ یہ ہیرا نقلی ہے؟ یہ تو بادشاہ نے میرے باپ کو انعام میں دیا تھا۔"

"کسی نے بھی دیا ہو، بہر حال یہ ہیرا نقلی ہے۔" سوداگر نے زور دے کر کہا۔

سوداگر کا جواب سننے کے بعد بوڑھا افسردہ ہو گیا اور مدھم سی آواز میں کہنے لگا: "مجھے روپوں کی سخت ضرورت ہے۔ تم کسی بھی قیمت پر یہ ہیرا خرید لو۔"

"مگر بھئی، میں اس نقلی ہیرے کا کیا کروں گا؟" سوداگر نے مکاری سے جواب دیا۔

"تم تو سوداگر ہو۔ کسی کے ہاتھ بیچ دینا۔" بوڑھے نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

سوداگر تو چاہتا ہی تھا۔ اس نے پانچ اشرفیاں بوڑھے کو دے کر اس پر احسان جتاتے ہوئے کہا: "یہ اتنے کا مال نہیں، لیکن میں تمھاری ضعیفی پر ترس کھا کر کچھ زیادہ ہی دے رہا ہوں۔"

اشرفیاں لے کر وہ بوڑھا چلا گیا تو سوداگر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ اس نے ایک قیمتی ہیرا کوڑیوں کے مول خرید لیا ہے۔

اگلی صبح سوداگر نے قافلے کو کوچ کرنے کا حکم دیا۔ دوپہر کے قریب یہ قافلہ شہر پہنچ گیا۔ بادشاہ کے حکم سے بازار ایک میدان میں لگا کرتا تھا اور بادشاہ خود بھی اس میدان میں خرید و فروخت کے لیے جاتا تھا۔ میدان میں جگہ جگہ خیمے لگے ہوئے تھے اور ہر ایک دروازے پر ایک دکان سجی ہوئی تھی۔ لوگ خریداری میں

مصروف تھے۔ سوداگر نے بھی ایک جگہ خیمہ لگایا اور دروازے پر دکان سجا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک طرف سے شور غل سا بلند ہوا۔ معلوم کرنے پر پتا چلا کہ بادشاہ سلامت تشریف لا رہے ہیں۔ بادشاہ سلامت آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسی سوداگر کی دکان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ سوداگر کی دکان میں وہ ہیرا بھی چمک رہا تھا، جسے سوداگر نے بوڑھے کو دھوکا دے کر سستے داموں خرید لیا تھا۔

"یہ ہیرا اصلی ہے یا نقلی؟" بادشاہ نے ہیرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عجیب انداز میں پوچھا۔

سوداگر نے چونک کر بادشاہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے بادشاہ کا چہرہ جانا پہچانا معلوم ہوا۔ غور کرنے پر سوداگر نے بادشاہ کو پہچان لیا۔ اب تو وہ لرز گیا۔ بادشاہ وہی بوڑھا تھا، جس سے سوداگر نے دھوکا دے کر ہتھیا لیا تھا۔ بادشاہ نے سوداگر کی حالت کو دیکھ کر بھرپور قہقہہ لگایا اور سخت لہجے میں بولا: "میں وہی رات والا بوڑھا ہوں اور اب تم مجھے بادشاہ کے روپ میں دیکھ رہے ہو۔ یہی میرا اصل روپ ہے۔ میرے ملک میں جب کوئی نیا تاجر آتا ہے تو میں اس طرح آزما کر اس کا امتحان لیتا ہوں اور اگر تاجر جھوٹا ہو تو میں اس کے ساتھ جو سلوک کرتا ہوں، وہ تو تم اب دیکھ ہی لو گے۔" اتنا کہہ کر بادشاہ نے اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ اس دھوکے باز سوداگر کو گرفتار کر لو۔ بادشاہ نے اس کا سب مال و اسباب ضبط کر کے اسے جیل کی تاریک کوٹھری میں بھیج دیا۔ اس طرح سوداگر کو اپنی بے ایمانی کی سزا مل گئی۔

پرانا ٹھکانا

ارم نسیم خان، کراچی

"مٹھو توتے! چوری کھاؤ گے؟"

مہک نے پنجرے کو ہاتھ سے جھولا جھلاتے ہوئے کہا۔ مہک کا معمول تھا۔ اسکول سے واپس آ کر گھر میں داخل ہوتے ہی ہاتھ سے توتے کا پنجرہ زور سے جھلاتی اور پوچھتی: "چوری کھاؤ گے؟"

کیا عجیب لڑکی ہے۔ روز پوچھتی ہے، لیکن دیتی کچھ نہیں۔ توتے نے غصے سے سوچا اور پنجرے میں چکر کاٹنے لگا۔ کاش! میری زبان انسان سمجھنے لگیں تو پھر دیکھو، جو کچھ یہ خود کھاتے ہیں، وہ میں مانگ مانگ کر خوب کھاؤں۔

رمضان کے مہینے میں تو توتے میاں کے مزے آگئے۔ ہر روز افطاری اور سحری کا بچا کھچا کچھ نہ کچھ اس کے پنجرے میں ڈال دیا جاتا۔ کچھ دنوں سے اماں بی کی طبیعت ناساز چل رہی تھی، جس کی وجہ سے توتے کی دیکھ بھال، اس کے پنجرے کی دھلائی وغیرہ میں کوتاہی ہونے لگی تھی۔ اب مہک کی ذمے داری لگائی گئی کہ وہ توتے کے کھانے پینے کا خیال رکھے۔

مہک بی بی کی کاہلی اور سستی تھی کہ جانے کا نام ہی نہ لیتی۔ بھلا وہ یہ ذمے داری خوبی سے کیسے نبھاتیں۔ سو اب کبھی میاں توتے کی پانی کی کٹوری خالی رہ جاتی اور کبھی کئی کئی دن تک پنجرے کی صفائی نہ ہوتی۔ صفائی پسند توتے کو اپنے پنجرے میں اُبکائی آنے لگتی۔ آخر وہ تنگ آگئے۔ یوں بھی غلامی کی زندگی بھلا کسے پسند ہوتی ہے۔ مہک نے اماں بی کی ڈانٹ سن کر ایک دن کھونٹی سے توتے کا پنجرہ اُتارا اور پانی کی دھار لگا کر دھلائی کرنی شروع کر دی۔ اسی دھلائی میں پنجرے کی کنڈی اوپر نیچے جو ہوئی تو توتے میاں نے فوراً چونچ مار کر دروازہ دھکیلا اور اُڑ کر جامن کے پیڑ پر جا پہنچے۔ مہک "ارے رے رے" کرتی رہ گئی۔ پیڑ میں توتے نے اپنے آپ کو پتوں میں چھپا لیا، کیوں کہ پنجرے کی دھلائی میں ان کے پر بھی اچھے خاصے گیلے ہو چکے تھے۔ انھوں نے غنیمت جانا کہ کچھ دیر یہیں رک کر جسم سوکھنے کا انتظار کیا جائے، تاکہ اڑنے میں آسانی ہو۔

توتے میاں پیڑ پر بیٹھے بیٹھے گھر میں اُٹھنے والی چیخ و پکار سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اماں بی، مہک کو خوب کوسنے دے رہی ہیں۔ توتے میاں پر سوکھنے کے بعد آسمان کی طرف پرواز کر گئے۔

اماں بی کے لیے دوسرا توتا بازار سے لایا گیا۔ تب بھی انھیں قرار نہ آیا تو اسے پھر بازار میں بیچ دیا گیا۔ پڑوسن نے ایک دن یہ اطلاع دی کہ ان کا توتا ہمارے محلے میں ہی اُڑتا رہتا ہے۔ میں نے خود دیکھا تھا اور پہچان بھی گئی تھی۔ دوسری پڑوسن نے بھی تصدیق کی اور جمن حلوائی نے بھی اطلاع دی کہ وہ توتا میری دکان کے قریب پیپل کے درخت پر بھی صبح صبح بیٹھ کر ٹیں ٹیں کرتا ہے۔

پھر یوں ہوا کہ ایک صبح اماں بی فجر کی نماز پڑھ کر دو ہیں سو رہی تھیں کہ سرہانے ان کے گمشدہ توتے کی آواز آئی۔ اماں بی تو جھٹکے سے اُٹھ بیٹھیں اور گھر والے بھی صحن میں جمع ہو گئے۔ توتے میاں کو پکڑنے کے بارے میں ابھی سوچا ہی جا رہا تھا کہ وہ خود ہی پھر سے اُڑ کر اماں بی کے کندھے پر چڑھ گئے اور گول گول گھومنے لگے۔

اماں بی کی محبت توتے کو واپس کھینچ لائی۔ واقعی انسان تو انسان جانور بھی محبت کی زبان کا بھرم رکھتے ہیں اور توتے میاں سوچ رہے تھے کہ گھر کے باہر کی آزادی میں منڈلانے والے خطرات بھوک سے زیادہ جان کا خطرہ بنے ہوئے تھے۔ کبھی چیل جھپٹتی تو کبھیں کوے غول کی صورت میں تاک لگائے اُڑ رہے ہیں۔ پھر انسان بھی اسے پنجرے میں قید کرنے کے لیے بے قرار دکھائی دیتا، لہٰذا میری واپسی خود میری اپنی خوشی بھی ہے۔

اس کے بعد کبھی توتے میاں کو پنجرے کی قید نہیں سہنی پڑی۔ وہ پورے گھر میں آزادی سے اُڑتے، پھدکتے پھرتے، کھانے کے وقت دسترخوان کے اختتام پر گھر والوں کے ساتھ توتے میاں کا چھوٹا سا سر بھی نظر آ رہا ہوتا۔

پاکستانی بچے

مرسلہ: ایلا محمود عالم انصاری، میرپور خاص

ہم پاکستانی بچے ہیں
اپنی بات کے سچے ہیں
شوق سے ہم سب پڑھتے ہیں
ہم سچی باتیں کرتے ہیں

آزادی ہم کو پیاری ہے
یہ سچی بات ہماری ہے
یہ پیارا دیس ہمارا ہے
یہ ہم کو جان سے پیارا ہے
ہم پاک وطن کے پیارے ہیں
ہم اس کی آنکھ کے تارے ہیں

پچھتاوا

سارہ قاضی، واہ کینٹ

بھالو میاں کا ڈاکٹر بننا تھا کہ پورے جنگل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب تمام جانور، چرند پرند بیماری کی صورت میں بھالو میاں کے پاس جاتے تھے اور بروقت علاج کی وجہ سے ان کی زندگیاں کافی حد تک محفوظ ہو گئی تھیں۔

آج جنگل میں بہت ہل چل مچی ہوئی تھی۔ بھالو میاں نے تمام جانوروں کو جنگل کے میدان میں بلوایا تھا، کیوں کہ وہ جانوروں کو خسرے کے متعلق آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ تمام جانور بڑے میدان میں اکھٹے ہو گئے۔ جنگل کے بادشاہ شیر صاحب اس جلسے کے مہمانِ خصوصی تھے۔ بھالو میاں اسٹیج پر تشریف لائے اور انھوں نے خسرے کے متعلق لیکچر دے کر جانوروں کو یہ احساس دلایا کہ اس سے بچاؤ کے لیے حفاظتی ٹیکے لگوانا نہایت ضروری ہیں۔ چناں چہ جنگل کے بادشاہ شیر نے ہرنی کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی کہ وہ بدھ کے دن جنگل کے تمام بچوں کو لے کر بھالو میاں کے کلینک پر پہنچ جائیں، تاکہ بچوں کو خسرے کے ٹیکے لگ سکیں۔ یہ اعلان سن کر تمام بچے خوف زدہ ہو گئے۔ ننھا خرگوش اور ننھی گلہری جو آپس میں گہرے دوست تھے، وہ بھی پریشان ہو گئے۔ خرگوش نے پریشانی سے گلہری کی طرف دیکھا اور بولا: ''ٹیکے لگوانے سے تو بہت درد ہوتا ہے۔ اب ہم کیا کریں گے؟ ہمیں اس سے بچنے کی کوئی ترکیب سوچنی چاہیے۔'' گلہری بولی: ''لیکن میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔ تم کچھ سوچو۔'' خرگوش میاں سوچتے ہی رہ گئے اور بدھ کا دن آپہنچا۔ خرگوش اور گلہری جنگل کے تمام دوسرے بچوں کے ساتھ بھالو میاں کے کلینک کی طرف رواں دواں تھے۔ جب یہ لوگ کلینک پہنچے تو بھالو میاں بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے بچوں کو پیار کرتے ہوئے سمجھایا کہ ڈرنے کی ضرورت نہیں ٹیکا لگنے سے درد بالکل نہیں ہوگا اور ٹیکا لگنے کے بعد تمام بچوں کو ایک ایک چاکلیٹ ملے گی۔ چاکلیٹ کا سن کر تمام بچے خوش ہو گئے۔ خرگوش اور گلہری کے منھ میں بھی پانی آگیا، لیکن ٹیکے کا خوف اپنی جگہ موجود تھا۔ وہ دونوں اب بھی ٹیکے سے بچنے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے۔ ہرنی تمام بچوں کو لے کر ویٹنگ روم میں بیٹھ گئیں۔ ان دونوں نے موقع دیکھ کر ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور چپکے سے باہر نکل آئے۔ بھالو میاں کے کمرے کے باہر ایک چارٹ لگا ہوا تھا، جس میں تمام بچوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ جو بچہ ٹیکا لگوا کر باہر آتا، وہ بی لومڑی سے جو نرس کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں، اپنا نام کٹوا لیتا۔ انھوں نے ادھر اُدھر دیکھا تو آس پاس کوئی نہیں تھا، لہٰذا گلہری نے قلم اُٹھایا اور خرگوش کے کندھوں پر کھڑے ہو کر چارٹ پر سے اپنا نام اور خرگوش کا نام کاٹ دیا۔ یہ کارنامہ انجام دے کر وہ دونوں بہت خوش ہوئے اور خوشی خوشی کلینک میں گھومنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ویٹنگ روم میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ تمام بچوں کے بازوؤں پر چھوٹی سی پٹی بندھی ہوئی تھی اور انھوں نے ہاتھوں میں چاکلیٹ تھامی ہوئی تھی۔ ہرنی نے ان دونوں کو دیکھ کر پوچھا کہ تم دونوں کی پٹیاں کہاں گئیں؟ اس پر گلہری نے گھبرا کر خرگوش کو دیکھا تو خرگوش بولا: ''وہ تو ہم نے فوراً اُتار دی تھیں۔ ہمیں درد نہیں ہوا۔ ہم بہت بہادر بچے ہیں۔'' اس پر ہرنی نے خوش ہو کر انھیں پیار کیا اور بولیں: ''تم دونوں واقعی بہت بہادر بچے ہو۔'' یوں جھوٹ بول کر ان دونوں نے اپنی جان بچالی اور نہایت خوشی خوشی گھر کی طرف چل پڑے۔ کچھ دنوں بعد کی بات ہے کہ خرگوش میاں کو بخار اور سر درد نے آگھیرا اور پھر ان کے جسم پر دانوں کے نشان اُبھر آئے۔ یہی حال گلہری کا ہوا۔ دونوں کو خسرے کی بیماری نے گھیر لیا تھا، لہٰذا دونوں درد سے بے حال بستر پر پڑے کڑوی کڑوی دوائیں

کھانے پر مجبور تھے، جب کہ باقی بچے جنھوں نے ٹیکے کی تکلیف برداشت کی، وہ خوشی خوشی جنگل میں کودتے پھاندتے پھر رہے تھے۔ خرگوش اور گلہری بستر پر پڑے درد سے کراہتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ کاش! اس وقت ہم ٹیکے کی تھوڑی سی تکلیف برداشت کر لیتے تو آج اتنی زیادہ تکلیف برداشت نہ کرنی پڑتی۔ آج ہم بھی جنگل کے باقی بچوں کی طرح کھیل کود میں مصروف ہوتے۔ چوں کہ ان کی بیماری نے ان کا ٹیکے سے بچاؤ کا پول بھی کھول دیا تھا، لہٰذا ان کی بدنامی بھی خوب ہوئی تھی اور وہ دونوں شرمندہ شرمندہ سب سے منھ چھپائے پھرتے تھے۔ وہ دونوں اب پچھتا رہے تھے۔

علم کی دولت

عروج قیوم، کراچی

''سر! آج کی ساری میٹنگز ہو چکی ہیں۔ اب آپ کی کوئی میٹنگ نہیں ہے۔'' ملازم نے اپنے باس سدون علی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ اور کل کی ساری میٹنگ کینسل کر دو۔ شاید میں کل آفس نہ آسکوں۔'' سدون علی نے کہا۔

''ٹھیک ہے سر!'' ملازم نے جواب دیا اور سدون علی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابھی گاڑی سگنل پر رکی ہی تھی کہ سدون علی کی نظر سڑک کے کنارے کھڑے ایک بچے پر پڑی جو لوگوں کی گاڑیوں کے پاس جا جا کر بھیک مانگ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سدون علی اپنے ماضی میں جا پہنچے۔

''باس! آج ۵۰۰ رپے کمائے ہیں۔'' راجو نے کہا۔

''کیا، کیا کہا تو نے، ۵۰۰ رپے؟ ارے واہ، تُو نے تو سب سے زیادہ کمائی کی ہے آج۔ واہ، جیتے رہو پتر!''

راجو، باس کے کمرے سے نکلا تو بہت خوش تھا، کیوں کہ آج پہلی مرتبہ باس نے اسے شاباشی دی تھی۔ حسبِ معمول وہ اپنے کمرے سے نکلا اور دوبارہ اڈے پر جا کر بھیک مانگنے لگا۔ ابھی وہ ایک گاڑی سے دوسری گاڑی کی طرف جا ہی رہا تھا کہ کسی شخص نے راجو کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے وہاں سے لے کر اپنی گاڑی میں بٹھا کر کہیں دور لے کر آ گیا۔ جب راجو شہر سے دور ایک عمارت میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہاں کئی بچے پڑھائی میں مصروف ہیں اور کچھ بچے ہنر سیکھ رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ''سنو بیٹے! اب تم ہمیں اپنی پوری کہانی بتاؤ، تا کہ ہم تمھاری مدد کر سکیں۔'' ایک نرم و ملائم آواز راجو کے کان سے ٹکرائی اور وہ ڈر گیا۔

''ڈرو نہیں لڑکے! ہم تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ ہم تو بس تم جیسے بچوں کو راستے سے اُٹھا کر یہاں لاتے ہیں اور اپنی پوری کوشش کرتے ہیں کہ تم جیسے بچوں کو دنیاوی اور دینی تعلیم دے سکیں، تا کہ تم لوگ بڑے ہو کر اپنے ملک کی خدمت کر سکو اور ہم یہاں بیٹھے بیٹھے جنت میں اپنا گھر بنوا لیں۔ اچھا اب تم بے فکر ہو کر ہمیں اپنی زندگی کی کہانی سناؤ کہ کس طرح تم بھکاری بنے اور تم پر کیا کیا ظلم ہوئے؟''

''میں اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نہ یہ جانتا ہوں کہ میرے ماں باپ کہاں ہیں۔ بس جب میں نے ہوش سنبھالا تو سب سے پہلے مجھے بھیک مانگنے کی تربیت دی گئی اور پھر ایک نام دیا گیا، راجو اور میں کچھ نہیں جانتا۔'' راجو یہ سب کہہ کر چپ ہو گیا۔

''میں جانتا تھا لڑکے! کہ تم بھیک خوشی سے نہیں مانگتے۔ اسی لیے میں تمھیں یہاں لے آیا کہ تم یہاں دل لگا کر پڑھو اور جو دل میں چاہے، وہ ہنر سیکھو۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ بڑے ہو کر تم اپنے وطن کی خدمت کرو گے۔ تمھیں یہاں کسی قسم کی کوئی بھی تکلیف نہیں ہوگی۔'' وہ شخص تو یہ کہہ کر چلا گیا، مگر راجو کے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔

بیس سال بعد ایک دن راجو بھاگتا ہوا اپنے محسن کے کمرے میں گیا۔

''مبارک ہو سر! مجھے نوکری مل گئی ہے۔''

''کیا کہا، ارے واہ راجو! اب تو وہ دن بھی دور نہیں، جب تم بھی ایک امیر آدمی بنو گے اور دوسرے لوگوں کی مدد کرنے والے شخص ہو گے۔'' انھوں نے راجو کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں سر! بس یہ سب آپ ہی کی

کوششوں کا نتیجہ ہے، جو آپ نے مجھ جیسے بھکاری کو پڑھا لکھا کر اور ہنر سکھا کر اس قابل کیا ہے۔" راجو تقریباً روتے ہوئے بولا۔

"نہیں راجو! اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمھیں پڑھنے کی ہمت دی، ورنہ کچھ بچے تو یہاں آ کر موقع ملتے ہی بھاگ جاتے ہیں، لیکن راجو اب تم اس دنیا کے لیے راجو کے نام سے نہیں بلکہ میرے دیے ہوئے نام سدون علی کے نام سے جانے جاؤ گے اور ویسے بھی وقت کے ساتھ سب کچھ بدل جاتا ہے۔"

"جی ہاں سر! بالکل۔" اور اس دن راجو یعنی سدون علی اپنے محسن سے وعدہ کر کے گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ بچوں کو وہ یہاں لانے کی کوشش کرے گا۔

سدون علی جیسے ہی اپنے ماضی سے لوٹے، وہ فوراً گاڑی سے اُترے اور ان کے قدم اس بچے کی طرف بڑھنے لگے، تا کہ وہ اس معصوم کو وہاں شہر سے دور عمارت میں پہنچا سکیں اور شان دار مستقبل کے لیے تیار کر سکیں۔ ☆

آپ کی تحریر کیوں نہیں چھپی؟

اس لیے کہ تحریر ◆ دل چسپ نہیں تھی۔ ◆ با مقصد نہیں تھی۔ ◆ طویل تھی۔ ◆ صحیح الفاظ میں نہیں تھی۔ ◆ صاف صاف نہیں لکھی تھی۔ ◆ پنسل سے لکھی تھی۔ ◆ ایک سطر چھوڑ کر نہیں لکھی تھی۔ صفحے کے دونوں طرف لکھی تھی۔ ◆ نام اور پتا صاف نہیں لکھا تھا۔ ◆ اصل کے بجائے فوٹو کاپی بھیجی تھی۔ ◆ نونہالوں کے لیے مناسب نہیں تھی۔ ◆ پہلے کہیں چھپ چکی تھی۔ ◆ معلوماتی تحریروں کے بارے میں یہ نہیں لکھا تھا کہ معلومات کہاں سے لی ہیں۔ ◆ نصابی کتاب سے بھیجی تھی۔ ◆ چھوٹی چھوٹی کئی چیزیں مثلاً شعر، لطیفہ، اقوال وغیرہ ایک ہی صفحے پر لکھے تھے۔

یہ بھی یاد رکھیے:

[illegible]

(ادارہ)

جوابات معلومات افزا - ۱۸۴

سوالات اپریل ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئے تھے

۱۔ حضرت اسماعیلؑ کو ذبیح اللہ کہا جاتا ہے۔

۲۔ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانے والے بارہ ساتھیوں کو حواری کہا جاتا ہے۔

۳۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کی شہادت سنہ ۴۰ ہجری ہجری میں ہوئی تھی۔

۴۔ سلطان عبدالحمید ثانی سلطنت عثمانیہ کے خلیفہ تھے۔

۵۔ غیاث الدین بلبن، خاندان غلامان کے مشہور حکمراں تھے۔

۶۔ دوسری جنگِ عظیم ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی۔

۷۔ پاکستان جولائی ۱۹۵۲ء میں انٹرنیشنل کرکٹ کا رکن بنا تھا۔

۸۔ علامہ اقبال نے ۲۱- اپریل ۱۹۳۸ء کو بروز جمعرات وفات پائی۔

۹۔ پاکستان کے معروف سائنس داں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی، مشہور سیاست داں چودھری خلیق الزماں کے بھائی تھے۔

۱۰۔ بھارت کے شہر بنارس کا پرانا نام وارنسی ہے۔

۱۱۔ ممباسا افریقی ملک کینیا کی بندرگاہ ہے۔

۱۲۔ جمہوریہ جبوتی کے سکے کا نام فرانک ہے۔

۱۳۔ سبزی خور جانور کنگرو کے جسم میں اس کے بچے کے لیے ایک تھیلی لگی ہوتی ہے۔

۱۴۔ مشہور شاعر تشنہ کا اصل نام عالم تاب تھا۔

۱۵۔ اردو زبان کی ایک کہاوت یہ ہے: "مرغ کی ایک ہی ٹانگ۔"

۱۶۔ وزیر علی صبا کے اس شعر کا دوسرا مصرع اس طرح درست ہے:

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔

نونہال لغت

لفظ	تلفظ	معنی
پشواز	پِ شْ وَا ز	عورتوں کی ایک پوشاک جو پاؤں تک لمبی اور گھیرے والی ہوتی ہے۔ یہ عموماً گانے ناچنے والی عورتیں پہنتی ہیں۔
شناور	شَ نَا وَ ر	تیراک۔ تیرنے والا۔
زنبیل	زَ نْ بِی ل	ٹوکری جو کھجور کے پتوں سے بنی ہوتی ہے۔ بٹوا۔ جھولی۔ تھیلی۔
بے کراں	بے کَ رَا ں	بے حد۔ بے انتہا۔ لامحدود۔ بغیر کناروں کے۔ بہت وسیع۔
چوگان	چَ وْ گَا ن	ایک قسم کی گیند کا کھیل جو گھوڑے پر بیٹھ کر لمبی لکڑی کے بلے سے کھیلتے ہیں۔ پولو۔
مصلحت	مَ صْ لَ حَ ت	حکمت۔ پالیسی۔ اچھا مشورہ۔ خوبی۔ بھلائی۔
عافیت	عَا فِ یَ ت	سلامتی۔ بچاؤ۔ آرام۔ آسائش۔ نیکی۔ خیریت۔
گنجان	گُ نْ جَا ن	گھنا۔ پاس پاس۔ ملا ہوا۔
پاس بان	پَا سْ بَا ن	نگہبانی کرنے والا۔ چوکیدار۔ دربان۔ گڈریا۔
دلارا	دُ لَا رَا	پیارا۔ عزیز۔
دربدر	دَ رْ بَ دَ ر	ایک دروازے سے دوسرے دروازے پر۔ آوارہ۔
چشم دید	چَ شْ مْ دِی د	آنکھوں دیکھا۔
انگوچھا	اَ نْ گَ وْ چھا	تہ بند۔ چھوٹی لنگی۔ تولیا۔
بھرم	بَھ رَ م	شہرت۔ عزت۔ آبرو۔ بھروسا۔ ساکھ۔ اعتبار۔
تابع	تَا بِ ع	فرماں بردار۔ ماتحت۔ پابند۔
سراپا	سَ رَا پَا	تمام بدن۔ سر سے پاؤں تک۔ حلیہ۔

ہمدرد نونہال
جون ۲۰۱۱ء
رجسٹرڈ نمبر ایس ایس ۶۹